سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

الرسالہ

ایک شخص نے کاروبار شروع کیا اور زبردست محنت کر کے اس میں کافی ترقی کی۔ اس کے دوست نے اس کو عید کارڈ بھیجتے ہوئے لکھا: "سلف میڈ مین کے نام جو قطب مینار کی بلندیوں کو بھی پار کر سکتا ہے"

وہ لوگ اور بھی زیادہ خوش نصیب ہیں جو ایمان و اسلام کی بلندیوں کو پار کریں۔ آخرت کے دن خدا کے فرشتے ان کو مبارکباد دیتے ہوئے کہیں گے: پچھلی زندگی میں تم نے آج کے لئے عمل کیا تھا۔ اب اس کا بے حساب انعام لو اور خدا کی جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔

شمارہ ۱۲
نومبر ۱۹۷۷

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
ڈھ روپے

عزّت و ذلّت کا معیار

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص سامنے سے گزرا۔ اس کا عمدہ لباس اور اس کا شاندار جسم بتا رہا تھا کہ یہ بستی کا صاحب حیثیت آدمی ہے۔ آپؐ نے حاضرین سے کہا: اس شخص کے بارے میں تم لوگوں کی کیا رائے ہے۔ کسی نے جواب دیا، یا رسول اللہ، یہ یہاں کے شریف لوگوں میں سے ہے۔ خدا کی قسم وہ اس قابل ہے کہ اگر کسی گھر میں نکاح کا پیغام دے تو قبول کیا جائے۔ کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش مانی جائے۔

آپ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد ایک اور شخص سامنے سے گزرا۔ آپ نے دوبارہ حاضرین سے پوچھا، اس کے بارے میں کیا رائے ہے۔ کسی نے کہا، یا رسول اللہ یہ ایک غریب مسلمان ہے۔ کہیں نکاح کا پیغام دے تو قبول نہ کیا جائے، کہیں سفارش کرے تو اس کی سفارش سنی نہ جائے۔ بات کرے تو کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

"پہلی قسم کے آدمیوں سے اگر ساری زمین بھر جائے تو خدا کی نظر میں ایسا ایک شخص ان سے بہتر ہوگا"

فہرست

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت ختم ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ الرسالہ کو آپ نے اپنے لئے مفید پایا ہوگا۔ اور آئندہ بھی اس کا مطالعہ پسند فرمائیں گے۔
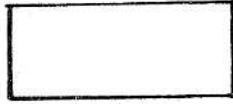
براہِ کرم سالانہ زرِ تعاون بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں تاکہ الرسالہ آپ کے نام جاری رکھا جا سکے

منیجر ماہنامہ الرسالہ

جمعیتہ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

جب برائی کو نیکی کے خانہ میں لکھ دیا جائے

اللہ تعالیٰ نے اپنے وفادار بندوں کے لئے جن انعامات کا وعدہ کیا ہے، ان میں سے ایک خصوصی وعدہ وہ ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰت (فرقان - ۷۰) اللہ ان کی برائیوں کو بدل دیتا ہے بھلائیوں سے

اس خدائی انعام کا تعلق اصلاً اس انفرادی یافت سے ہے جو ایک بندۂ مومن کو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ تاہم اس کا ایک اجتماعی پہلو بھی ہے۔ یہاں ہم دونوں پہلوؤں کے بارے میں مختصراً عرض کریں گے۔

انسان کو کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ لغزشوں اور کوتاہیوں سے پاک نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بجائے خود مطلوب بھی ہے کہ انسان غلطی کرے۔ ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی کہ انسان اگر گناہ نہ کرتا تو اللہ دوسری مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرے اور پھر اللہ سے معافی مانگے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے، وہ عجز ہے۔ یہ احساس کہ "میں نے غلطی کی" آدمی کے اندر عجز کا جذبہ زیادہ ابھارتا ہے بہ نسبت اس احساس کے کہ "میری زندگی گناہوں سے پاک ہے"۔ مومنانہ قلب رکھنے والے ایک آدمی سے جب کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو وہ فوراً تڑپ اٹھتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ بیتاب ہو جاتا ہے کہ شیطانی ترغیبات اور نفسانی محرکات کے مقابلہ میں وہ کتنا کمزور ثابت ہوا۔ بے چارگی اور شرمندگی کے جذبہ کے تحت وہ دوبارہ خدا کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ وہ اپنی اس عاجزانہ حیثیت کو پالیتا ہے کہ خدا اگر میری مدد نہ کرے تو میں اپنے کو سنبھال نہیں سکتا۔ میرے اندر کوئی ذاتی طاقت نہیں۔ انسان اگر غلطی نہ کرے تو اندیشہ ہے کہ اس کے اندر گھمنڈ کی نفسیات پیدا ہو جائے اور نتیجۃً وہی چیز (عجز) اس سے چھن جائے جو بندہ ہونے کی حیثیت سے اس کا اصل زیور ہے:

والذی نفسی بیدہ لو لم تذنبوا لخشیت علیکم ماھو اشد منہ وھو العجب (رزین)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم گناہ نہ کرو تو تمہارے بارے میں مجھے اس سے بھی زیادہ سخت چیز کا اندیشہ ہے، اور وہ عُجب ہے۔

اللہ کے یہاں "نیکیوں" کی گنتی اور کارناموں کے انبار کی قیمت نہیں۔ اس کو تو ٹوٹے ہوئے دل درکار ہیں (انا عند المنکسرۃ قلوبھم) وہ ایسے بندوں کو پسند کرتا ہے جن کا کلمہ یہ ہو کہ میرے رب! میں تو کچھ بھی نہ کرسکا۔ میری زندگی تو غفلتوں میں گزر گئی۔ یہ محض مصنوعی طور پر نہ ہو بلکہ یہی آدمی کا واقعی احساس بن جائے۔ حتیٰ کہ اس کا احساسِ عجز اتنا بڑھ جائے کہ یہ کلمہ بھی اس کی زبان سے ادا نہ ہو، وہ آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ اگر آدمی

کی لغزش اُس کے اندر اِس احساس عبدیت کو ابھارنے کا سبب بن جائے تو وہ خدا کی نظر میں اتنا محبوب ہو جاتی ہے کہ وہ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ میرے بندے کی اس لغزش کو اس کے اعمال نامہ میں حسنات کے خانہ میں لکھ دو۔ کیونکہ وہ میرے بندے کو مجھ سے قریب لے آئی ہے۔ اس کے برعکس جو نیکی آدمی کے اندر فخر کا احساس پیدا کرے، اس کے متعلق اندیشہ ہے کہ وہ سیئات کے خانہ میں نہ لکھ دی جائے۔ کیونکہ وہ بندے کو خدا سے دور کرنے کا سبب بنی۔

غلطیاں ہر ایک سے سرزد ہوتی ہیں۔ مومن سے بھی اور غیر مومن سے بھی۔ مگر جس کو حقیقی معنوں میں عبدیت کا مقام حاصل ہوتا ہے، اس سے جب کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو وہ فوراً چونک اٹھتا ہے۔ اس کا احساسِ گناہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دگنی شدت کے ساتھ اپنے رب کی طرف دوڑے۔ اس کی غلطی اس کو نئی اعلیٰ تر قسم کی ایمانی کیفیات سے لبریز کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اللہ سے خوف و محبت کا نیا طوفان اس کے اندر امنڈ آتا ہے۔ اللہ کی طرف رجوع، جو تمام عبادات کی روح ہے، اس کے اندر پہلے سے بھی زیادہ بڑے پیمانہ پر پیدا ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ گناہ جو اپنے بعد خشیت اور تضرع کے آنسو لے آئے، وہ نہ صرف گناہ کی سیاہی کو دھو دیتا ہے، بلکہ خود گناہ کو نیکی کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ نتیجۃً اس نے جو چیز پیدا کی، وہ وہی تھی جو تمام نیکیوں کا اصل مقصود ہے۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جن کے اندر عبدیت کا احساس بیدار نہ ہوا ہو۔ جن کا حال یہ ہو کہ گناہ کرنے کے بعد بھی شرمندگی اور گنہ گاری کا جذبہ ان کے اندر نہ ابھرے۔ ایسے لوگ غلطیوں کے اندھیرے میں گم رہتے ہیں۔ ان کی لغزشیں ان کو عجز اور انابت کی خوراک نہیں دیتیں بلکہ ان کی قساوت کو بڑھاتی رہتی ہیں وہ ہر گناہ کے بعد اگلے گناہ کے لئے کچھ اور جری ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انھوں نے اپنی باگ شیطان کے ہاتھ میں دے دی ہے، اور وہ جدھر چاہتا ہے، انھیں کھینچے لئے پھرتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَيْفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ ۝ وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ ۝

اعراف — ۲۰۲

جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں، جب شیطان کا کوئی گروہ انھیں چھوتا ہے تو وہ چونک جاتے ہیں۔ پھر ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو شیطان کے بھائی ہیں، وہ ان کو گمراہی میں کھینچے رہتے ہیں، پھر کمی نہیں کرتے۔

مومن کی سیئات کو حسنات سے بدل دینے کا دوسرا پہلو وہ ہے جو اجتماعیات سے متعلق ہے۔ یہ اہلِ ایمان کے ساتھ اللہ کا وہ خاص معاملہ ہے جب کہ وہ ان کے ناموافق حالات (DISADVANTAGE) کو موافق حالات (ADVANTAGE) میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ مدد چونکہ ایک اعتبار سے دنیوی ہے، اس لئے، پہلی قسم کی مدد کے برعکس، وہ بعض اوقات غیر اہل ایمان کے حصہ میں بھی آجاتی ہے۔ تاہم دونوں گروہوں میں ایک فرق ہے۔ جہاں تک خدا کے مومن بندوں کا تعلق ہے، ان کے لئے اس قسم کی مدد کی یقینی ضمانت ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب یہ مدد انھیں مخالفینِ اسلام کے مقابلہ میں درکار ہو۔ جب کہ غیر اہلِ ایمان کے لئے اس طرح کی کوئی ضمانت نہیں۔

اسلام کی تاریخ اس قسم کی مدد کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔

۱۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں، مکہ میں مسلمانوں کے حالات اتنے سخت ہو گئے کہ ان کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہ رہی کہ اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جائیں۔ انھوں نے حبش کا انتخاب کیا جو عرب کی سرحد پر تھا اور اس وقت وہاں ایک عیسائی بادشاہ (نجاشی) حکومت کر رہا تھا جس کی نیک نفسی مشہور تھی۔ ۶۱۵ء میں پندرہ آدمی جدہ پہنچے اور کشتیوں سے سفر کر کے حبش کے ساحل پر اتر گئے۔ دوسری بار ۶۱۷ء میں ایک سو مسلمانوں کا قافلہ حبش گیا۔

گھربار، جائداد، اعزہ اقربا کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں جانا بظاہر ایک ناپسندیدہ واقعہ تھا۔ مگر اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے خیر کی صورت پیدا کر دی۔ مسلمانوں کا حبش پہنچنا، سمندر پار کے ایک ملک میں اسلام کو موضوع بحث بنانے کا سبب بن گیا۔ پیغمبر اسلام کی بعثت اور آپ کی دعوت کی خبریں حبش میں پھیلنے لگیں۔ قریش کے ایک مخالفانہ وفد کی آمد کی وجہ سے مسلمانوں کے سردار جعفر بن ابی طالب کو موقع ملا کہ وہ شاہی دربار میں اسلام کی دعوت پر مفصل تقریر کر سکیں۔ ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ حبش سے ۲۰ عیسائی علماء کا وفد تحقیق حال کے لئے مکہ آیا۔ اور اسلام قبول کر کے اپنے ملک واپس ہوا۔ (قصص ۵۵ - ۵۲) اس طرح وہ تحریک جو ہجرت حبش سے پہلے مکہ کی ایک قصباتی تحریک کی حیثیت رکھتی تھی، ہجرت حبش کے بعد اس نے بین الاقوامی تحریک کی حیثیت حاصل کر لی۔

۲۔ اسلام جب عرب میں ظاہر ہوا، اس وقت عرب کے شمال اور جنوب میں تمام علاقے اس زمانہ کی دو بڑی شہنشاہیتوں، ساسانی سلطنت اور بازنطینی سلطنت کے ماتحت تھے۔ یہ سلطنتیں اس کو برداشت نہ کر سکتی تھیں کہ قلب عرب میں کوئی آزاد اقتدار قائم ہو۔ اور ترقی کرے۔ ان کے اس جذبہ کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا رہتا تھا۔ اسی کی ایک مثال ۸ھ کا وہ واقعہ ہے جب کہ بُصری کے گورنر شرحبیل بن عمرو غسانی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کو شام کے سرحدی قصبہ موتہ میں قتل کر دیا۔ یہ حارث بن عمیر ازدی تھے جو آپ کی طرف سے دعوت اسلام کا مکتوب لے کر حاکم بُصریٰ کے پاس گئے تھے۔

بین اقوامی روایت کے مطابق یہ واقعہ ایک ملک پر دوسرے ملک کی جارحیت کے ہم معنی تھا۔ یہ خبریں بھی آنے لگیں کہ شام کی طرف سے رومی فوجیں پیش قدمی کر کے مدینہ میں داخل ہونا چاہتی ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے اس کا فوجی جواب دینا ضروری سمجھا۔ آپؐ نے تین ہزار کا ایک لشکر تیار کیا اور زید بن حارثہ کو اس کا سردار مقرر کر کے شام کی طرف روانہ کیا۔ موتہ کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ مگر مسلمانوں کے تین ہزار فوجیوں کے مقابلہ میں رومیوں کی ایک لاکھ سے بھی زیادہ فوج اکھٹا ہو گئی۔ حضرت زیدؓ سمیت تقریباً دو ہزار مسلمان شہید ہو گئے اور بقیہ فوج اس حال میں واپس ہوئی کہ مدینہ والوں نے ان کا استقبال یا فرّار (اے بھاگنے والو) کہہ کر کیا۔

پیغمبر اسلامؐ کی پوری ۲۳ سالہ نبوی زندگی میں یہ سب سے بڑا نقصان کا واقعہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حیرت انگیز طور پر اس کے اندر سے ایک عظیم الشان خیر کا پہلو پیدا کر دیا۔ عرب کے مسلمان جن قبائل سے تعلق رکھتے تھے، وہ صدیوں

سے آپس میں لڑتے چلے آرہے تھے۔ جنگ ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ شدید اندیشہ تھا کہ اپنی قوتوں کے اظہار کا کوئی میدان نہ پاکر وہ دوبارہ آپس میں لڑنے لگیں۔ غزوۂ موتہ کے حادثہ نے اس کا بہترین حل فراہم کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں کی جارحیت کا جواب دینے کے لئے دوبارہ ایک عظیم تر فوج ترتیب دی اور اس کا سردار اسامہ بن زیدؓ کو بنایا جن کے دل میں رومیوں سے انتقام کا شدید جذبہ بھرا ہوا تھا، کیونکہ انھوں نے آپ کے والد زید بن حارثہ رضؓ کو قتل کیا تھا۔

اس طرح پیغمبر اسلامؐ کو موقع ملا کہ اپنے آخری ایام میں عربوں کو رومی شہنشاہیت سے متصادم کر کے ان کی جنگجو فطرت کے لئے عمل کا ایک میدان فراہم کر دیں۔ چنانچہ تاریخ نے دیکھا کہ وہ لوگ جو اپنے ہم وطنوں کی قتل و غارتگری کے سوا اور کچھ نہ جانتے تھے، انھوں نے ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں ایک پوری دنیا میں اسلام کا اقتدار قائم کر دیا۔

۰۳ اسی قسم کی ایک مثال تیرھویں صدی عیسوی میں مسلم دنیا پر مغلوں اور تاتاریوں کا حملہ بھی ہے۔ ان وحشی قبائل نے مشرق کی جانب سے عالم اسلام پر حملہ کیا اور اس کے بڑے حصہ کو تاراج کر ڈالا۔ ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کو مکمل شکست ہوئی۔ یہ سب سے بڑی سیاسی آفت تھی جو مسلمانوں کی پوری تاریخ میں ان کے اوپر نازل ہوئی۔ مگر اس کے اندر سے حیرت انگیز طور پر ایک نیا امکان پیدا ہو گیا۔ فتح نے تاتاریوں کے انتقامی جذبہ کو ختم کر دیا۔ اب وہ نفسیاتی طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ مفتوح کے مذہب و عقائد پر بے لاگ رائے قائم کر سکیں۔ مسلمانوں سے اختلاط نے ان کو ایک صحیح آسمانی مذہب سے واقف کرایا جو اب تک مذہب کے نام سے جاہلانہ اوہام پرستی کے سوا اور کچھ نہ جانتے تھے۔ انھیں نظر آیا کہ اسلام ایک سچا دین ہے اور اس میں خود ان کی اپنی بھلائی چھپی ہوئی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی شکست پر ایک صدی بھی نہیں گزری تھی کہ تمام تاتاری مسلمان ہو گئے۔

اس فتح کا یہی فائدہ نہیں ہوا کہ وہ تمام مسجدیں جن کو ہلاکو نے سمرقند سے حلب تک اپنے راستہ میں تباہ کی تھیں، اس کے پوتوں نے دوبارہ ان کی تعمیر کی اور ان کی چھتوں کے نیچے خدائے واحد کے آگے سجدہ کیا۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عرب اور ایرانی قومیں جو اب تک اسلام کی علم برداری کر رہی تھیں، عیش اور حکمرانی نے انھیں کمزور کر دیا تھا۔ اب ایک تازہ دم گروہ کی ضرورت تھی جو اسلام کی پاسبان بنے۔ مغل اور تاتاری، جو در اصل وحشی قبائل تھے، ان صلاحیتوں سے بھرپور تھے۔ انھوں نے اسلام قبول کر کے اسلام کا علم اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے بعد چھ سو برس تک اسلام کے طاقتور محافظ بنے رہے۔

اسلام کی تاریخ میں اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جب کہ ہمارا رب ہمارے ناموافق حالات کو ہمارے لئے موافق بناتا رہا۔ یہ تاریخ آج بھی دہرائی جا سکتی ہے بشرطیکہ ہم اپنی طرف سے استحقاق کی وہ شرط پوری کرنے کے لئے تیار ہوں جس کا پورا کرنا خدا کی سنت کے مطابق ضروری ہے۔

جو اپنے کو جہنم کے دروازہ پر کھڑا ہوا پائے وہی جنت میں داخل ہوگا۔

جو چپ رہنے لگے اس کو بولنا آگیا

جو بے عزتی پر راضی ہو جائے اس نے اپنی عزت کو بچا لیا

جو خاموش آوازوں کو سننے لگے وہی کان والا ہے۔

جس کو اپنی برائیاں دکھائی دینے لگیں وہی قابل تعریف ہے

جو اپنے سے آغاز کرے وہی دوسروں تک پہنچے گا

جو اپنی غلطی کو مان لے وہی صحیح راستہ پر ہے

جس کی نظر میں تمام چیزیں بے لذت ہو جائیں اس نے لذت کا راز پالیا

جو اپنے کو بے علم جانے وہی علم والا ہے۔

وہی آدمی باشعور ہے جس نے اپنے لاشعور کو جان لیا

جو کمزوروں سے ڈرے وہی طاقت ور کی پکڑ سے بچ سکتا ہے

جو دوسروں کو دیتا ہے اسی نے اپنے آپ پر خرچ کیا

جو اپنے معاملات میں نادان ہو جائے وہی ملت کے معاملات میں ہوشیار ثابت ہوگا۔

جس کو اپنے منافق ہونے کا اندیشہ ہو وہی ایمان والا ہے

جو کھونے والا ہے اسی نے دراصل پایا

جس کو ہارنا آجائے اس کو کوئی ہرا نہیں سکتا

موت کے اُس پار

ستارے اور سیارے کبھی اپنے مقررہ راستے سے نہیں بھٹکتے۔ درختوں اور پہاڑوں کے سامنے کبھی یہ مسئلہ نہیں آتا کہ وہ اپنی زندگی کے نظام کو کس طرح بہتر بنائیں۔ کسی جانور کو کبھی یہ سوال پریشان نہیں کرتا کہ وہ اپنی غیر حاصل شدہ تمناؤں کو کیسے پورا کرے۔ انسان کے سوا جتنی چیزیں اس کائنات میں ہیں، سب ویسی ہی ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے۔ معلوم دنیا میں صرف انسان ہے جو اس احساس سے دوچار ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے، اس کو حاصل نہیں کر سکتا اور نہ موجودہ دنیا میں کبھی اس کا حصول ممکن ہے۔

ہمارے اور موجودہ دنیا کے درمیان اس تضاد کو ہمیشہ لوگوں نے محسوس کیا ہے۔ عام انسان صرف یہ سوچتا ہے کہ وہ بیماری، حادثہ، بڑھاپا، موت سے آزاد زندگی پانا چاہتا ہے مگر وہ اسے پا نہیں سکتا۔ علماء اور مفکرین زیادہ گہرائی تک جاتے ہیں اور زیادہ دور رس قسم کے ناموافق پہلوؤں کا انکشاف کرتے ہیں جو انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان فیصلہ کن طور پر حائل ہیں۔

انسان خلاؤں کو ناپتا ہے اور اقتدار کے خواب دیکھتا ہے۔ مگر وہ کس قدر عاجز اور حقیر ہے، اس کو ایک مثال میں دیکھئے۔ زمین پر آج جتنے انسان پائے جاتے ہیں، اگر ان میں کا ہر آدمی چھ فٹ لمبا، ڈھائی فٹ چوڑا اور ایک فٹ موٹا ہو تو پوری آبادی کو بہ آسانی ایک ایسے صندوق میں بند کیا جا سکتا ہے جو طول وعرض اور بلندی میں ایک میل ہو۔ پھر اگر اس صندوق کو کسی سمندر کے کنارے لے جا کر ایک ہلکا سا دھکا دے دیں تو وہ پانی کی گہرائی میں پہنچ کر گم ہو جائے گا۔ صدیاں گزر جائیں گی مگر نسل انسانی دوبارہ زمین پر چلتی پھرتی دکھائی نہ دے گی۔ دنیا کے ذہن سے یہ بھی محو ہو جائے گا کہ یہاں انسان کی قسم کی کوئی مخلوق آباد تھی۔ سمندر کی سطح پر اسی طرح بدستور طوفان اٹھتے رہیں گے، سورج اسی طرح چمکتا رہے گا۔ کرۂ ارض اپنے محور پر بدستور گھومتا رہے گا۔ کائنات کی لامحدود پہنائیوں میں پھیلی ہوئی بے شمار دنیائیں اتنے بڑے حادثہ کو ایک معمولی واقعہ سے زیادہ اہمیت نہ دیں گی۔ مدتوں کے بعد ایک اونچا سا مٹی کا ڈھیر زبان حال سے بتائے گا کہ یہ نسل انسانی کی قبر ہے جہاں وہ صدیوں پہلے ایک چھوٹے سے صندوق میں دفن کی گئی تھی۔

سر جیمز جینز (۱۸۷۷ — ۱۹۴۶) کائنات کی بے پناہ وسعت کے مقابلے میں انسان اور اس کے وطن (زمین) کی معمولی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ریت کے ذرہ کے ایک خوردبینی ٹکڑے پر کھڑے ہو کر ہم کائنات کی فطرت اور اس کے مقصد کو معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو کہ زمان ومکان کے اندر ہمارے وطن (زمین) کو گھیرے ہوئے ہے۔ ہمارا پہلا تاثر کچھ دہشت ناک قسم کا ہوتا ہے۔ ہم کائنات کو دہشتناک پاتے ہیں اس کے وسیع ناقابل فہم فاصلوں کی وجہ سے، دہشت ناک اس کے لامعلوم حد تک لمبے پھیلے ہوئے وقت کی وجہ سے جس کے مقابلے میں انسانی تاریخ محض پلک جھپکانے

کے بقدر معلوم ہوتی ہے، دہشت ناک ہماری انتہا درجہ کی تنہائی کی وجہ سے، اور خلا میں ہمارے وطن کے مادی طور پر بالکل بے حقیقت ہونے کی وجہ سے ــــــ ساری دنیا کے سمندروں میں پائے جانے والے ریت کے ذروں میں سے ایک ذرہ کا دس لاکھواں حصہ۔ مگر ان سب سے بڑھ کر کائنات کو ہم اس لئے دہشت ناک پاتے ہیں کہ وہ ہماری جیسی ایک زندگی کے معاملہ میں غیر جانب دار ہے: جذبات، حوصلے، کامیابیاں، آرٹ اور مذہب، سب اس کے منصوبے میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ شاید ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہماری جیسی زندگی کی دشمن ہے۔ کیوں کہ خالی خلا کا بیشتر حصہ اس قدر سرد ہے کہ تمام زندگی اس کے اندر منجمد ہو جائے گی۔ خلا کے اندر مادّہ کا بیشتر حصہ اس قدر گرم ہے کہ اس کے اوپر زندگی کا وجود ناممکن ہے۔ خلا خم دار ہے اور فلکیاتی اجسام پر مسلسل مختلف قسم کی ریڈیائی بمباری ہوتی رہتی ہے، جن میں سے اکثر اغلباً زندگی کے لئے مخالف یا تباہ کن ہیں۔ اس قسم کی ایک دنیا میں ہم ٹپک پڑے ہیں، اگر غلطی سے نہیں تو کم از کم اس چیز کے نتیجہ میں جس کو اتفاق کہا جا سکتا ہے۔ (۳)

سیاراتی نظام (جس میں ہماری زمین ہے) انتہائی نادر خلائی واقعہ ہے۔ سیاراتی نظام کا اس قدر نادر ہونا بے حد اہم ہے۔ کیونکہ زندگی کی جس قسم سے ہم زمین پر واقف ہیں، وہ زمین ہی جیسے کسی سیارہ پر وجود میں آ سکتی ہے۔ اس کو اپنے ظہور کے لئے موافق طبعی حالات درکار ہیں جن میں سب سے اہم وہ ٹمپریچر ہے جس میں اشیاء رقیق شکل میں باقی رہ سکیں۔ (۴)

ان وجوہ سے، یہ ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے کہ کائنات ابتدائی طور پر ہماری جیسی زندگی کے لئے بنائی گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو یقینی طور پر ہم میکانزم کے حجم اور پیداوار کی مقدار میں زیادہ بہتر تناسب کی توقع کر سکتے تھے۔ کم از کم پہلی نظر میں زندگی انتہائی غیر اہم ضمنی پیداوار دکھائی دیتی ہے۔ ہم زندہ لوگ شارع عام سے کچھ ہٹے ہوئے ہیں۔

WE LIVING THINGS ARE SOMHOW OFF THE MAIN LINE (P.5)

سائنس نے اب تک جو معلومات دی ہیں، ان کے مطابق ہم نہایت تعجب انگیز طور پر وجود میں آئے ہیں۔ اور ہماری حیرانی میں صرف اضافہ ہوتا ہے جب ہم اپنی ابتدا کے مسئلہ سے آگے بڑھ کر اپنے وجود کی معنویت کو سمجھنا چاہتے ہیں یا یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ قسمت نے مستقبل میں ہماری نسل کے لئے کیا چیز ذخیرہ کر رکھی ہے (۱۰)

فزکس اور فلکیات دونوں ایک ہی کہانی بتاتے ہیں۔ وہ یہ کہ کائنات کا صرف ایک ہی انجام ہو سکتا ہے۔ اور وہ ہے حراراتی موت (HEAT DEATH) ۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ اس آخری انجام تک پہنچنے کا راستہ کیا ہوگا۔ کائناتی موت کے سوا اس سفر کا دوسرا کوئی انجام نہیں ہو سکتا:

END OF THE JOURNEY CANNOT BE OTHER THAN UNIVERSAL DEATH (P.11)

پھر کیا ایسا ہے کہ زندگی محض اتفاق سے ایک ایسی کائنات میں بھٹک آئی ہے جو واضح طور پر زندگی کے لئے نہیں بنائی گئی تھی۔ اور جو تمام مظاہر کے مطابق یا تو مکمل طور پر غیر جانب دار ہے یا قطعی طور پر اس کے مخالف۔ ایک ذرّے کے محض ایک ٹکڑے پر ہمیں اس وقت تک چمٹے رہنا ہے جب کہ ہم منجمد ہو جائیں، اپنے مختصر

اسٹیج پر مختصر تر لمحات کے لئے اکڑ کر چلنا یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے تمام حوصلے بالآخر فنا ہو جانے والے ہیں، اور یہ کہ ہماری کامیابیاں ہماری نسل کے خاتمہ کے ساتھ ختم ہو جائیں گی، کائنات کے باقی رہتے ہوئے جہاں ہم موجود نہ ہوں گے (۱۲) THE MYSTERIOUS UNIVERSE, PP. 3-12

ان احساسات کا اظہار تاریخ کے ہر دور میں مختلف سوچنے والے لوگ مختلف انداز میں کرتے رہے ہیں۔ کریسی مارسین (۱۹۴۶ - ۱۸۸۴) زندگی کا سائنسی مطالعہ کرتے ہوئے بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:

WHENCE LIFE COME, WHERE LIFE GOES, SCIENCE ANSWERS NOT

زندگی کب اس زمین پر آئی، زندگی کہاں جارہی ہے، سائنس ہمیں اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔

آئن سٹائن (۱۹۵۵ - ۱۸۷۹) اپنے سائنسی علم کی روشنی میں جب انسان پر غور کرتا ہے تو اس کے پاس اس اقرار کے سوا کوئی اور بات کہنے کے لئے نہیں ہوتی:

MAN IS OUT OF PLAN. HE HAS COME WHERE HE WAS NOT WANTED

آدمی اس دنیا میں بے جگہ معلوم ہوتا ہے، وہ ایسے مقام پر آ گیا ہے جہاں وہ مطلوب نہ تھا۔

انسان جو کچھ پانا چاہتا ہے، وہ موجودہ دنیا کے ڈھانچہ میں ممکن نہیں۔ انسان ابدی زندگی چاہتا ہے مگر اس کو ابدی دنیا نہیں دی گئی۔ وہ اپنے لئے ایک بہتر کل (BETTER TOMORROW) پیدا کرنا چاہتا ہے، مگر آنے والا کل اس کے لئے جو چیز لے کر آرہا ہے، وہ حادثہ، بڑھاپا اور موت ہے۔ وہ ایک آزاد، برائیوں سے پاک اور خوشیوں سے بھری دنیا دیکھنا چاہتا ہے، مگر ایسی دنیا اس زمین پر کسی طرح بننے نہیں پاتی۔

اب دو ہی متبادل قیاسات ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ زندگی، برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰ - ۱۸۷۲) کے الفاظ میں، نظام شمسی کے وسیع قبرستان میں اپنی تمام کامیابیوں اور ناکامیوں کے ساتھ بالآخر ہمیشہ کے لئے دفن ہو جانے والی ہے۔ اس کے بعد مدفن (مادی دنیا) شاید کسی شکل میں باقی رہے مگر دفن ہونے والے (انسان) کا اس میں کہیں وجود نہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ موجودہ دنیا کے علاوہ یا اس کے بعد کوئی اور زیادہ مکمل دنیا ہے جہاں انسان اپنے خوابوں کی زندگی کو پا سکتا ہے۔ موت اگلی وسیع تر زندگی کی طرف سفر ہے نہ کہ اس کا خاتمہ۔ گویا ہمارے اور ہماری آرزوؤں کے درمیان وہی نسبت ہے جو بچہ اور انسان کے درمیان پائی جاتی ہے۔ بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں یہ آرزو لئے ہوئے بند رہتا ہے کہ وہ ایک وسیع کائنات کے اندر ایک پورے قد کا انسان بن کر ظاہر ہو۔ پیٹ کے اندر کی محدود دنیا میں یہ محض ایک موہوم خواب معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب وہ ایک دن ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے تو اچانک وہ پاتا ہے کہ اس کا خواب ایک انتہائی حقیقی خواب تھا جو مکمل تعبیر کی صورت میں اس کے قریب ہی موجود تھا، اگرچہ پیٹ کے اندر رہتے ہوئے وہ اس کو براہ راست نہیں جان سکتا تھا یا کم از کم نہیں جان سکا تھا۔

پہلے قیاس کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ وہ چیز جس کو ہم انسان کہتے ہیں، وہ صرف ایک جسم کا نام ہے جسم کی موت کے بعد لازمی طور پر "انسان" کی موت بھی ہو جاتی ہے۔ مگر اس مفروضہ کے حق میں کوئی قطعی دلیل اب تک

قائم نہ ہوسکی۔ تمام دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ مگر یہ دلیل اصل دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ موت کے دن جو "انسان" جسم سے الگ ہوتا ہے، وہ موت سے پہلے بھی ہمارے لئے قابل مشاہدہ نہیں ہوتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے سوچنے اور محسوس کرنے والے انسان کو دیکھا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم انسان کے صرف اس جسم کو دیکھتے ہیں جو ملکیات و معدنیات سے مل کر بنا ہے۔ ماورائے جسم انسان، جو موت کے دن خاموش ہوجاتا ہے، اس کو ہم مرنے سے پہلے بھی نہیں دیکھتے ۔۔ پھر مرنے کے بعد اگر وہ دکھائی نہ دے تو اس سے اس کا عدم وجود کیسے ثابت ہوجائے گا۔ مزید یہ کہ جدید سائنس یہ ثابت کررہی ہے کہ مادہ جب "فنا" ہوتا ہے تو وہ فنا نہیں ہوتا۔ بلکہ زیادہ حقیقی اور ترقی یافتہ شکل اختیار کرلیتا ہے، یعنی انرجی کی شکل۔

فلاسفہ و مفکرین موت کے بعد زندگی کے عقلی و منطقی ثبوت دیتے رہے ہیں۔ بعض ثبوت ان میں بجائے خود وزنی بھی ہیں۔ مثلاً فرد جاف شوان (FRITHJOF SCHUAN) کا یہ قول کہ روح جو دراصل ذہن یا شعور ہے اس کے غیر فانی ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس کا اختتام اپنے سے کم درجہ پر نہیں ہوسکتا، دوسرے لفظوں میں مادہ یا مادہ کا ذہنی انعکاس کی صورت میں۔ کوئی برتر چیز کم تر چیز کا محض فعل نہیں ہوسکتی۔ وہ اس چیز کا صرف ذریعہ نہیں ہوسکتی جس سے وہ بڑھ جاتی ہے:

ONE PROOF OF IMMORTALITY OF THE SOUL - WHICH IS ESSENTIALLY INTELLIGENCE OR CONSCIOUSNESS - IS THAT THE SOUL COULD NOT HAVE AN END BENEATH ITSELF, IN OTHER WORDS MATTER OR THE MENTAL REFLECTION OF MATTER. THE HIGHER CANNOT BE MERELY A FUNCTION OF THE LOWER, IT CANNOT BE ONLY A MEANS IN RELATION TO WHAT IT SURPASSES.

Frithjof Schuan, Understanding Islam

تاہم، اپنی تمام تر معقولیت کے باوجود، اس قسم کے استدلات قیاسی استدلالات تھے، اس لئے جدید ذہن کے لئے ان میں زیادہ اپیل نہ تھی۔ جدید ذہن حسی استدلال کو اہمیت دیتا ہے۔ وہ اسی دلیل کو دلیل سمجھتا ہے جس کو وہ چھوئے، دیکھے اور تجربہ کرے۔ قیاسی منطق پر قائم ہونے والی دلیل اس کے نزدیک معتبر نہیں۔

مگر بیسویں صدی کے نصف آخر میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، انھوں نے حیرت انگیز طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ قیاسی دلائل کے علاوہ خالص تجرباتی نوعیت کے شواہد بھی قدیم زمانہ سے یہاں موجود تھے۔ مگر علمی اصولوں پر ان کا منظم مطالعہ نہیں کیا گیا اور بلا تحقیق یہ فرض کیا جاتا رہا کہ موت کے بعد زندگی کے حق میں کوئی تجرباتی دلیل موجود نہیں ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۳۹ میں بتایا گیا ہے: اللہ موت کے وقت جانوں کو کھینچ لیتا ہے۔ اور جن کے مرنے کا وقت نہیں آیا، ان کی نیند میں۔ پھر ان جانوں کو روک لیتا ہے جن پر مرنا ٹھیرا دیا ہے اور باقی جانوں کو ایک میعاد تک کے لئے رہا کر دیتا ہے (زمر۔ ۴۲) قدیم ترین زمانہ سے خواب اس قرآنی بیان کی تصدیق کررہے تھے۔ مگر قدیم زمانہ میں خواب کے فلسفیانہ پہلوؤں پر زیادہ غور نہیں کیا گیا۔ موجودہ زمانہ میں جب ان کا علمی تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ واقعات، حیرت انگیز طور پر، یہ ثابت کررہے ہیں کہ روح یا شعور جسم سے الگ ایک مستقل حقیقت ہے۔ وہ

جسم سے الگ ہو کر بھی پوری طرح باقی رہتا ہے۔ خواب، موت کے بعد زندگی کو تجرباتی سطح پر ثابت کر رہے ہیں۔

عام تجربہ ہے کہ خواب میں ایک شخص دور کے کسی واقعہ کو یا مستقبل میں پیش آنے والے کسی حادثہ کو دیکھ لیتا ہے۔ یہ تجربات جو تقریباً ہر شخص کو پیش آتے ہیں، ثابت کرتے ہیں کہ خواب کی حالت میں آدمی کا شعور موجودہ مادی دنیا سے اوپر اٹھ جاتا ہے اور ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں زمان و مکان کی حد بندیاں نہیں پائی جاتیں۔ نیند کے وقت سونے والے آدمی پر جو بے خبری طاری ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی روح، جزوی طور پر، اس کے جسم کو چھوڑ دیتی ہے۔ وہ انسان کی محدود دنیا سے نکل کر خدا کی ابدی دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔

راقم الحروف کی لڑکی فریدہ خانم (پیدائش ۱۹۵۲) نے ۲۴ جنوری ۱۹۷۱ کو دہلی میں خواب دیکھا کہ اس کے بھائی ظفر الاسلام خاں (پیدائش ۱۹۴۸) نے اس کے لئے دس روپے بھیجے ہیں۔ یہ خواب انتہائی غیر معمولی تھا۔ کیونکہ خواب دیکھنے والی کے بھائی ۱۹۶۶ سے قاہرہ میں تھے۔ اور باہر سے کوئی بھائی اپنی بہن کو "دس" روپے بھیجے، یہ کسی طرح قابل قیاس نہیں ہو سکتا۔ مگر چند ہی روز بعد ظفر الاسلام کا لفافہ قاہرہ سے ملا جس کے اندر دس روپے کا ایک ہندستانی نوٹ رکھا ہوا تھا۔ ظفر الاسلام کو یہ نوٹ قاہرہ میں اپنے بکس میں پڑا ہوا ملا۔ چونکہ عرب دنیا میں یہ نوٹ ان کے لئے بے کار تھا، انھوں نے ہندستان میں اپنی بہن کو خط بھیجتے ہوئے اس کو لفافہ میں ڈال دیا۔۔۔

اس کی توجیہہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی کہ نیند کی حالت میں آدمی کی روح جسمانی محدودیتوں سے آزاد ہو کر ایک بلند تر آفاقی سطح حاصل کر لیتی ہے۔ اس وقت وہ اشیاء کو ایسے مقام سے دیکھنے لگتی ہے جہاں وہ اپنی جسمانی قیام گاہ کی حد بندیوں سے نہیں دیکھ سکتی۔

اسی طرح سویا ہوا آدمی خواب میں بعض اوقات کسی مرے ہوئے شخص کو دیکھتا ہے۔ یہ مردہ شخص اپنے زندہ ساتھی کو خواب میں ایسی باتیں بتاتا ہے جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ شخص اب بھی پورے شعور کے ساتھ موجود ہے، اور خواب دیکھنے والے کی فی الواقع اس سے "ملاقات" ہوئی ہے۔ گویا سوئے ہوئے آدمی کے شعور کی سطح، ایک خاص حد تک، مرے ہوئے آدمیوں کے شعور کی سطح کے برابر ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر، نیند کی حالت میں آدمی، محدود معنوں میں، زندگی بعد موت کا تجربہ کرتا ہے۔ نیند کی حالت، جزوی طور پر موت کی حالت کے مشابہ ہے۔

ڈاکٹر کیسل نے شمالی کیرولینا کے ایک امیر شخص کے واقعہ کی تحقیق کی ہے۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ وہ کسی بات پر تین لڑکوں سے ناراض ہو گیا اور ایک وصیت نامہ کے ذریعہ اپنے ان تین لڑکوں کو جائداد میں حصہ دار بننے کے حق سے محروم کر دیا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے جلد ہی بعد اس کے چوتھے لڑکے نے، جس کو از روئے وصیت جائداد مل رہی تھی، اپنے باپ کو خواب میں دیکھا۔ خواب میں اس کے باپ نے اپنی پسندیدہ برساتیوں میں سے ایک برساتی اوڑھ رکھی تھی۔ وہ سراپا احتجاج دکھائی دیتا تھا اور دوران گفتگو بار بار برساتی نما کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ نیند کھلی تو لڑکے نے اپنے باپ کی اس کوٹ کو، جو اس نے خواب کے درمیان پہن

رکھا تھا۔ نکالا اور اس کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ جیب میں باپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک وصیت نامہ موجود تھا۔ اس کے تحت پچھلی وصیت کو منسوخ کرتے ہوئے بقیہ تینوں لڑکوں کو بھی حق دیا گیا تھا کہ وہ اپنے حصہ کی جائداد وصول کر سکتے ہیں۔ باپ نے موت سے تھوڑی دیر پہلے جائداد کی وراثت کے بارے میں اپنا فیصلہ بدل لیا تھا۔ اس نے دوبارہ اپنا وصیت نامہ تیار کرایا اور اس کو مکمل کر کے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ اپنے تمام لڑکوں کو اس تبدیلی فیصلہ سے آگاہ کرے، انتقال کر گیا ——

ظاہر ہے کہ اس واقعہ کو مردہ شخص کے سوا کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ اس لئے یقین کرنا پڑے گا کہ وہ مرنے کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں زندہ تھا اور اس نے اپنے لڑکے کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

نیند ہی سے ملتا جلتا وہ واقعہ ہے جب کہ حادثہ وغیرہ کے موقع پر ایک شخص وقتی طور پر "مرجاتا ہے" اور پھر کچھ دیر بعد جی اٹھتا ہے۔ قدیم زمانہ سے اس قسم کے واقعات ہوتے رہے ہیں کہ ایک شخص طبّی اعتبار سے مکمل طور پر مرگیا۔ چند منٹ بعد پھر اس کے قلب کی حرکت جاری ہوگئی۔ وہ دوبارہ "زندہ" ہوگیا۔ اس قسم کے واقعات بظاہر اس بات کا ثبوت ہیں کہ "آدمی" نے کچھ لمحات کے لئے اپنا جسم چھوڑ دیا تھا اور پھر دوبارہ اپنے جسم میں واپس آگیا۔ قدیم زمانہ میں ان واقعات کا ذکر صرف عجوبہ کے طور پر کیا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ان کو علمی انداز سے جانچا گیا تو معلوم ہوا کہ ان سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ انسان، جسم سے ماورا اپنی ایک مستقل ہستی رکھتا ہے جو اس وقت بھی باقی رہتی ہے جب کہ وہ اپنے دنیوی جسم سے الگ ہوگیا ہو۔

بعض ایسے واقعات ریکارڈ کئے گئے ہیں کہ ایک بیمار شخص آپریشن ٹیبل پر تھا، آپریشن کے دوران اس کے دل کی حرکت بند ہوگئی۔ طبّی طور پر وہ مرگیا۔ کچھ دیر بعد اس کو ہوش آیا۔ اس سے پوچھا گیا کہ "موت" کے دوران تم نے کیسا محسوس کیا۔ اس نے بتایا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنے جسم سے الگ ہو کر فضا میں تیر رہا ہوں۔ میں فضا سے اپنے جسم کو دیکھ رہا تھا جو آپریشن ٹیبل پر پڑا ہوا تھا اور اس کے گرد ڈاکٹر جھکے ہوئے تھے۔ اس نے اس دوران میں ہونے والی ڈاکٹروں کی بعض باتوں کو اس طرح بتایا جیسے کہ وہ "موت" کے وقت بھی ان کو دیکھ اور سن رہا تھا —— روح اگر محض ایک جسم کا عمل (FUNCTION) ہو تو وہ جسم سے الگ ہو کر کیسے اس طرح باقی رہ سکتی ہے۔ جسم سے الگ ہو کر بھی شعور ذات کا ختم نہ ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان ایک مستقل ہستی ہے جو جسم سے علیحدگی کے بعد بھی پوری طرح باقی رہتا ہے۔

ڈاکٹر گرفیلڈ بتاتے ہیں کہ میں ایک بوڑھی عورت کا معائنہ کر رہا تھا۔ یہ عورت ہڈی کے کینسر کی مریض تھی۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ ہم نے مریضہ کے درد کو دور کرنے کی جتنی تدبیریں کیں سب بے سود ثابت ہوئیں۔ اچانک وہ بے ہوش سی ہوگئی۔ اس کے بعد جب ہوش میں آئی تو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کو بہت افاقہ ہوگیا ہو۔ میں نے عورت سے اس کی اچانک تبدیلی کا سبب پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی اس کی مردہ ماں اس سے ملنے آئی تھی اور اس کو بتا گئی ہے کہ بہت جلد دونوں اکٹھا ہو جائیں گی۔ اپنی ماں سے اس گفتگو کے بعد وہ بہت پرسکون ہوگئی اور تھوڑی دیر

کے بعد مر گئی ـــــــ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ مریضہ کی ماں، اپنی موت کے بعد بھی پورے شعور کے ساتھ موجود تھی۔ ورنہ کس طرح وہ اپنی بیٹی کے پاس آتی۔ نیز ماں کی خبر کے مطابق ٹھیک وقت پر اس کا مرجانا ثابت کرتا ہے کہ مریضہ کا تجربہ حقیقی تھا نہ کہ محض خیالی۔

قرآن کی سورہ نمبر ۵۶ میں ارشاد ہوا ہے: جب مرنے والے کی جان حلق تک آجاتی ہے اور تم دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے۔ اس وقت تمھاری بہ نسبت ہم مرنے والے کے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں۔ مگر تم نہیں دیکھتے (واقعہ)۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی جب مرنے کے قریب ہوتا ہے تو جان کی جسم سے علیحدگی سے پہلے موت کے اُس پار کی بعض کھڑکیاں اس پر کھول دی جاتی ہیں۔ دوسری دنیا کا پردہ ایک خاص حد تک، اس سے ہٹالیا جاتا ہے۔ موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے وہ عالم آخرت کی بعض چیزوں کو دیکھنے لگتا ہے۔

ان میں سب سے عام اور کثیر الوقوع مشاہدہ اپنے مردہ عزیزوں کو دیکھنا ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آتا ہے جب کہ آدمی نزع کے عالم میں پہنچ گیا ہو۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ نزع کے وقت آدمی اپنے مرے ہوئے رشتہ داروں کو پکارنے لگتا ہے۔ اپنے مرے ہوئے اعزّہ اور دوستوں کو وہ اس طرح آواز دیتا ہے جیسے وہ اس کے قریب کھڑے ہوں۔ راقم الحروف کی بڑی بہن طاہرہ خانم کا انتقال تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں اگست ۱۹۷۶ میں ہوا۔ اس وقت وہ اعظم گڑھ کے اسپتال میں تھیں۔ انتقال کے وقت میں خود بہن کے پاس موجود نہ تھا۔ تاہم میری والدہ زیب النسار خاتون نے مجھے بتایا کہ آخر وقت میں مرحومہ کی زبان سے یہ کلمات سنے گئے: "ابّا اتنی دیر سے کھڑے ہیں کوئی ان کو بیٹھنے کے لئے نہیں دیتا" ہمارے والد کا انتقال ۱۹۲۹ میں ہو چکا ہے۔ اس لئے لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوا۔ مرحومہ کی لڑکی نے کہا: "ابا یہاں کہاں ہیں" مرحومہ نے دوبارہ کہا: "وہ کیا سامنے کھڑے ہیں" اور پھر چند لمحہ بعد ان کا خاتمہ ہو گیا۔

ڈاکٹر الزبتھ کیوبلر روز نے بطور مہم یہ کام شروع کیا کہ وہ نزع میں گرفتار لوگوں سے ملیں اور آخر وقت میں ان کی آوازوں کا ٹیپ لیں۔ انھوں نے ایک ہزار سے زیادہ ایسے لوگوں کا قریب سے مشاہدہ اور مطالعہ کیا جو عالم نزع میں گرفتار تھے۔ اور گویا موجودہ دنیا اور اگلی دنیا کے درمیان پہنچ چکے تھے۔ ان لوگوں نے انھیں بتایا کہ نزع کی حالت میں ان کے کچھ ایسے دوست اور رشتہ دار ان کے پاس آئے جو پہلے مر چکے تھے "تاکہ سفر آخرت کے وقت ان کی امداد کر سکیں"۔ یہ لوگ اگر اس دنیا میں اپنے بدن کے کسی عضو سے محروم تھے تو نزع کی حالت میں انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا بدن ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ مثلاً جو شخص لنگڑا تھا اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دونوں پاؤں صحیح و سالم موجود ہیں۔ گویا جسم میں کسی حادثہ سے کمی واقع ہو جائے تو اس کی وجہ سے اصل انسانی ہستی میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

اس قسم کے خواب اور واقعات اگرچہ ہمیشہ سے پیش آرہے تھے، مگر موجودہ زمانہ میں پہلی بار ان کا منظم مطالعہ کیا گیا ہے، ضروری اعداد و شمار کے ساتھ ہزاروں واقعات جمع کئے گئے ہیں خاص طور پر امریکہ میں جدید ترین ٹکنیک

اور سائنسی اہتمام کے ساتھ ان کا باقاعدہ جائزہ لیا جارہا ہے۔ ان تحقیقی نتائج پر متعدد کتابیں چھپی ہیں۔ حال میں امریکہ سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے زندگی کے بعد زندگی:

LIFE AFTER LIFE (U.S.A. 1976)
BY DR. RAYMOND A. MOODY JR.

یہ کتاب آج کی انتہائی کثیر الاشاعت کتابوں میں سے ہو رہی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے اخبارات و رسائل میں، جدید دور میں پہلی بار، زندگی بعد موت سے متعلق سرخیاں نظر آنے لگی ہیں۔ اس سلسلے میں تحقیقی کتابوں کے خلاصے شائع کئے جارہے ہیں۔ مثلاً نیوز ویک ۱۲ جولائی ۱۹۷۶، السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا مارچ ۱۹۷۷، ریڈرز ڈائجسٹ اگست ۱۹۷۷۔ ایک امریکی میگزین (ٹائم، ۴ جنوری ۱۹۷۷) کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ "موت" کا موضوع اور موت کے بعد زندگی کا مسئلہ اچانک طور پر امریکہ کا بہت زیادہ مقبول عام موضوع بن گیا ہے۔ اجتماعات میں اب موت کا موضوع جنس اور سیاست جیسے سدا بہار موضوعات سے تجاوز کرنے لگا ہے۔ کتابوں کی ایک نئی قسم وجود میں آگئی ہے جس کو علم الموت (THANATALOGY) کی کتابیں کہا جاتا ہے۔

آرتھر کوئسلر (ARTHUR KOESTLER) پہلے مارکسسٹ تھے، مگر اب وہ اس حد تک بدل چکے ہیں کہ انھوں نے ایک طویل محققانہ مقالہ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے "کیا موت کے بعد بھی زندگی ہے؟" IS THERE LIFE AFTER DEATH?

موجودہ صدی کے ربع ثانی میں آئن سٹائن، ڈی بروگلی، شرڈنگر اور ہیزن برگ نے کامیاب طور پر مادہ کا غیر مادہ ہونا ثابت کیا ہے۔ جو چیز دیکھنے میں ٹھوس جسم نظر آتی ہے، وہ انرجی (قوت) کا صرف ایک شدید اجتماع ہے۔ اس سے ثابت ہوا ہے کہ مادہ کے اجزاء — الکٹران، پروٹان، نیوٹران وغیرہ — معروف معنوں میں مادی ذرات نہیں ہیں بلکہ وہ لہروں کی مانند ہیں۔ ڈی بروگلی کا کہنا ہے کہ ایک الکٹران بیک وقت جسیمہ بھی ہے اور لہر بھی۔ ثنویت (DUALISM) جدید طبیعیات کا لازمہ ہے اور (PRINCIPLE OF COMPLEMENTARITY) یعنی تکمیلی اصول اس کا جدید سائنسی نام ہے۔ (سنڈے (کلکتہ) ۳ اکتوبر ۱۹۷۶)

ان دریافتوں کا حوالہ دیتے ہوئے آرتھر کوئسلر نے لکھا ہے کہ ذرہ/لہر (PARTICLE/WAVE) کے اصول کو مان لینے کے بعد جسم/ذہن (BODY/MIND) کے اصول کو ماننا آسان ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ تکمیلی اصول کو مان لینے کے بعد دوسری جگہ اس کو نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ ہم پوچھ سکتے ہیں کہ جب مادہ اپنے آپ کو لہروں میں تبدیل کرسکتا ہے اور اس طرح ایک خالص غیر جسمانی انرجی (DISEMBODIED ENERGY) بن جاتا ہے تو کیا اب بھی یہ خالی از معنی ہوگا کہ بے جسم ذہن (DISCARNATE MENTAL ENERGY) کی موجودگی کی بات کی جائے۔ کیا ایسی گفتگو اب بھی اسی طرح بے حقیقت ہے جس طرح وہ پچاس سال پہلے معلوم ہوتی تھی جب کہ طبیعیات نے ابھی مادہ کی حیثیت کو ختم نہیں کیا تھا اور ابھی ہم کو بتایا نہیں تھا کہ ایٹم "چیز" نہیں ہیں، اور کیا اب بھی یہ معقول بات ہوگی کہ کوئی شخص ذہنی مادہ (MIND-STUFF) کی اصطلاح کو غیر سائنسی کہہ کر مذاق اڑائے جس کو اڈنگٹن نے وضع کیا تھا۔ ڈاکٹر آئی۔ جے

گڈنے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مادہ اثیری ہے اور ذہن ٹھوس چٹان ہے :

MATTER IS AETHEREAL AND MIND IS THE SOLID ROCK

موت کے بعد زندگی کا ثبوت ہی یہ بھی ثابت کر دیتا ہے کہ موجودہ نظر آنے والی دنیا کے علاوہ ایک اور دنیا بھی ہے۔ اگر ایسی کوئی دنیا نہیں ہے تو یہ غیر مرئی انسانی ہستیاں کہاں واقع ہیں۔ لوگ اپنے جسم کو چھوڑ کر کہاں چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے اس طرح بندھی ہوئی ہیں کہ ایک کا ثابت ہونا اپنے آپ دوسرے کو ثابت کر دیتا ہے۔

قرآن میں کہا گیا ہے: اور ہر چیز کو ہم نے بنایا جوڑا جوڑا۔ تاکہ تم دھیان کرو (ذاریات - ۴۹) اس آیت میں اس بات کا اشارہ ہے کہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ ہر چیز جوڑے کی صورت میں ہے۔ (نر مادہ، مثبت منفی، رات دن) ایک جزو اپنے دوسرے جزو سے مل کر اپنے کو مکمل کرتا ہے۔ یہ اس لئے تاکہ لوگ سمجھیں کہ جس طرح ہر چیز کا جوڑا ہے اسی طرح اس دنیا کے لئے بھی جوڑا ہونا ضرور ہے۔ یہ جوڑا آخرت ہے۔ آخرت کے بغیر یہ دنیا، موجودہ تخلیقی نظام کے مطابق کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔

آج دنیا کا یہ جوڑا انسانی علم میں آچکا ہے۔ اس جوڑے کا سائنسی نام اینٹی ورلڈ ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک طرف انسان کا مطالعہ موت کے بعد انسانی ہستی کے بقا کا تجربہ کرار ہا تھا، دوسری طرف عین اسی وقت طبیعی سائنس یہ ثابت کر رہی تھی کہ ہماری موجودہ دنیا کے متوازی ایک اور دنیا ہے جو مکمل شکل میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ ہماری موجودہ دنیا ورلڈ ہے اور وہ اینٹی ورلڈ۔

۱۹۲۸ تک طبیعیات داں یہ سمجھتے تھے کہ تمام ایٹم صرف دو قسم کے ذرات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ مثبت برقی چارج رکھنے والے پروٹان، اور منفی برقی چارج رکھنے والے الکٹران۔ مگر اسی سال پال ڈیراک (PAUL A.M. DIRAC) نے ایک نئے قسم کے ذرہ کی موجودگی کا امکان ظاہر کیا۔ اس نے کہا "اس کا مقدار مادہ الکٹران جیسا ہے۔ مگر وہ اس کے مخالف برقی چارج رکھتا ہے۔ ہم اس ذرہ کو اینٹی الکٹران کہہ سکتے ہیں" ۱۹۳۲ میں اینڈرسن (K. ANDERSON) نے اس اینٹی الکٹران کو کاسمک شعاعوں میں دریافت کر لیا۔ اب معلوم ہوا کہ ایٹم کے ہر پارٹیکل کا ایک اینٹی پارٹیکل ہے۔ پروٹان ایک اینٹی پروٹان رکھتا ہے، نیوٹران ایک اینٹی نیوٹران رکھتا ہے۔ گویا کائنات کے تمام ذرات، جوڑ دار (PAIR PARTICLES) کی صورت میں ہیں۔

اب سائنسی فکر آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ معلوم ہوا کہ عالم مادی میں جوڑوں کی یہ تقسیم الکٹران کے ناقابل مشاہدہ ذرات سے شروع ہو کر خود مجموعہ عالم تک پہنچ جاتی ہے۔ الکٹران کا اینٹی الکٹران ہے، ایٹم کا اینٹی ایٹم، میٹر کا اینٹی میٹر، حتیٰ کہ ورلڈ کا اینٹی ورلڈ۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ہماری دنیا میں تمام اینٹی پارٹیکل غیر قائم (UNSTABLE) حالت میں ہیں۔ مگر اینٹی ورلڈ میں وہ سب قائم (STABLE) حالت میں ہوں گے۔ کیونکہ تمام ایٹموں کے نیوکلیس منفی برقی چارج رکھتے ہوں گے اور تمام الکٹران مثبت برقی چارج۔ اس قسم کے ایک اینٹی ورلڈ کا امکان پہلی بار ۱۹۳۳ میں ڈیراک نے اپنے لکچر میں بنایا تھا۔ اب سائنس داں عام طور پر اس کو تسلیم کرتے جا رہے ہیں۔ سوویت یونین کے ڈاکٹر

گستاف نان (GUSTAV NAAN) نے ریاضیات کے ذریعہ اس اینٹی ورلڈ کی ایسی ٹھوس احاطہ بندی کردی ہے کہ اب اس کے مخالفین تک اس کو انتہائی زبردست قسم کا متوازن تصور ماننے لگے ہیں ۔

اپنی دنیا میں دور کی چیزوں کو ہم فوٹان کی مدد سے پہچانتے ہیں جو کہ برقی مقناطیسی شعاعوں کے ذرات ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ بھی اسی قسم کے فوٹان کا اخراج کرتی ہوگی جو کہ بیک وقت پارٹیکل بھی ہے اور اینٹی پارٹیکل بھی ۔ اینٹی ورلڈ، وہ دور ہو یا نزدیک ، اس کی روشنی فوٹان کی شکل میں ہو سکتا ہے کہ مسلسل ہم تک پہنچ رہی ہو ۔ مگر ہم اس کو اپنے پازیٹو ورلڈ کی چیزوں کی روشنی سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے ۔ ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کے درمیان کیا رشتہ ہے ۔ کیا دونوں کے درمیان کوئی مواصلاتی سلسلہ ہے جس کے ذریعہ ہماری دنیا اینٹی ورلڈ سے تعلق قائم کرتی ہے ۔ سائنس دانوں کا جواب اثبات میں ہے ۔ ڈاکٹر نان کا خیال ہے کہ بلیک ہول اور وائٹ ہول کو ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کے درمیان ایک مقامی واسطہ (LOCAL CHANNELS) سمجھنا چاہئے ۔

بہت سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ ہم سے الگ اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتا ہے تخلیق کے بارے میں عظیم دھماکہ (BIG BANG) کا نظریہ فرض کرتا ہے کہ ۱۰ سے ۲۰ بلین سال پہلے سارا مادہ منجمد حالت میں ابتدائی ایٹم کی صورت میں تھا اور فوٹان انرجی پر مشتمل تھا ۔ قیاس ہے کہ فوٹان ، ایک عظیم دھماکہ کے ساتھ میٹر اور اینٹی میٹر کی صورت میں مجتمع ہو گئے اور ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کو بنانے کے لئے الگ الگ ہو گئے ۔ اسی بنیاد پر ہینز الفوین (HANNES ALFVEN) نے ۱۹۶۳ میں تفریقی میکانزم (SEPERATION MECHANISM) کا امکان ظاہر کیا جس کے ذریعہ ایک ہی کہکشاں میں میٹر اور اینٹی میٹر دونوں موجود رہتے ہیں ۔

سائنس یہاں پہنچ کر خاموش ہو جاتی ہے اور اسے خاموش ہو جانا چاہئے کیونکہ اس کا دائرۂ تحقیق صرف وہ واقعات ہیں جو قانون طبیعی کے تحت ظہور میں آتے ہیں ۔ ماورائے طبیعات چیزوں کے بارے میں وہ ہمیں کوئی قطعی بات نہیں بتا سکتی ۔ تاہم اس نے یہ تسلیم کر کے ہمارے لئے مزید تحقیق کا دروازہ کھول دیا ہے کہ استنباط (INFERENCE) بھی ایک جائز ذریعہ علم ہے بشرطیکہ وہ ثابت شدہ واقعات کی بنیاد پر کیا گیا ہو ۔ اس اصول کی روشنی میں اگر ہم یہ استنباط کریں کہ دوسری دنیا ، جہاں مرنے کے بعد انسان پہنچ رہا ہے ، غالباً وہی ہے جس کو سائنس نے اینٹی ورلڈ کا نام دیا ہے تو خالص علمی اعتبار سے اس کو نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی ۔

موجودہ معلوم دنیا میں جو صورت حال ہے ، وہ بھی یہی ہے ۔ سائنس کی پہنچ دنیا کے کمیاتی پہلوؤں تک ہے ۔ کیفیاتی پہلو اس کی دسترس سے باہر ہیں ۔ سائنس ہمیں پھول کی خبر دیتی ہے ، مگر وہ خوشبو کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی ۔ وہ ہمیں اشیاء کا پتہ دیتی ہے مگر ان کے حسن سے ہمیں مطلع نہیں کرتی ۔ وہ انسان سے ہمارا تعارف کراتی ہے مگر انسانی شعور کے بارے میں اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے ۔ اسی طرح اگر وہ ہمیں " اینٹی ورلڈ " کی خبر دے مگر اس کی "خوشبو" اس کے "حسن" ۔ اس کے "شعور" کو بتانے سے عاجز ہے تو اس پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے ۔ یہ خلا ہم اپنے استنباط کے ذریعہ اسی طرح پُر کر سکتے ہیں جس طرح ہم موجودہ معلوم دنیا کے بارے میں آج بھی کر رہے ہیں ۔

قرآن سمجھنے کے لئے

علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے سامنے قرآن کی یہ آیت پڑھی گئی:

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ — جس دن ہم بلائیں گے تمام آدمیوں کو ان کے مقتدا کے ساتھ۔

اس آدمی نے آیت کا مطلب یہ نکالا: جس دن ہم بلائیں گے سب کو ان کی ماؤں کے ساتھ۔

امام کا لفظ جو مفرد تھا، اس کو اُمّ (ماں) کی جمع سمجھ لیا گیا۔ حالاں کہ وہ شخص اگر قواعد صرف سے واقف ہوتا تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ اُم کی جمع امام نہیں آتی۔ اسی طرح مثلاً لفظ "مسیح" دو مادوں سے مشتق ہو سکتا ہے۔ اور دونوں کے الگ الگ معنی ہیں۔ اس کا اشتقاق مسح سے ہو تو اس کے معنے چھونے اور تر ہاتھ کسی چیز پر پھیرنے کے ہوں گے۔ اور اگر مساحت سے ہو تو اس کے معنی پیمائش کے ہوں گے، وغیرہ

انھیں وجوہ سے اہل فن نے قرآن کی تفسیر کے لئے پندرہ علوم پر مہارت ضروری بتائی ہے:

۰۱ لغت، جس سے قرآن کے مفرد الفاظ کے معنی معلوم ہو سکیں۔

۰۲ نحو، یعنی اعراب کا علم، کیونکہ عربی زبان میں زبر زیر کے فرق سے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔

۰۳ صرف، صیغوں کے اختلاف کو جاننا۔

۰۴ اشتقاق، یعنی کون کس مادّہ سے بنا ہے۔

۰۵ علم معانی، جس سے کلام کی ترکیبیں معنی کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہیں۔

۰۶ علم بیان، جس سے کلام کا ظہور و خفا، تشبیہہ و کنایہ معلوم ہوتا ہے۔

۰۷ علم بدیع، جس سے کلام کی خوبیاں تعبیر کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہیں۔

۰۸ علم قرأت، کیونکہ مختلف قرأتوں کی وجہ سے مختلف معنی معلوم ہوتے ہیں۔

۰۹ علم عقائد، تاکہ یہ معلوم ہو کہ کہاں ظاہر معنی مراد ہیں اور کہاں تاویل کی ضرورت ہے۔

۱۰ اصول فقہ، جس سے وجوہ استدلال و استنباط معلوم ہوتے ہیں۔

۱۱ اسباب نزول، کیونکہ شان نزول جاننے سے آیت کے معنی زیادہ واضح ہوتے ہیں۔

۱۲ علم ناسخ و منسوخ، تاکہ منسوخ شدہ احکام معمول بہا سے ممتاز ہو سکیں۔

۱۳ علم فقہ، کیونکہ جزئیات کے احاطہ سے کلیات پہچانے جاتے ہیں۔

۱۴ احادیث، یعنی وہ تفسیری روایات جو قرآن کی مجمل آیات کی تفسیر کرتی ہیں۔

۱۵ علم وہبی، وہ علم خاص جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

بعض لوگوں نے قرآن فہمی کے لئے اس سے کم یا اس سے زیادہ علوم بھی بیان کئے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام

غیر ضروری شرائط ہیں۔ ان کا غیر متعلق ہونا اس سے واضح ہے کہ ان میں سے اکثر علوم وہ ہیں جن سے صحابہ بالکل ناواقف تھے، وہ بعد کے دور میں بنائے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لئے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک ایمان، دوسرے عربی زبان۔ اگر آدمی کو فی الواقع ایمانی شعور حاصل ہو اور وہ عربی زبان سے بخوبی واقف ہو تو یقیناً اللہ کی مدد سے وہ کلام الٰہی کو سمجھ لے گا اس کے بعد کسی اور علم کی اس کو ضرورت نہیں۔

ایمان محض کلمہ کے الفاظ کو دہرانا نہیں ہے۔ ایمان دراصل فطرۃ اللہ کو پالینے کا نام ہے، وہ فطرت جس پر سارے انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ ایمان، مجمل شعور کے طور پر، آدمی کو خالق اور مخلوق کے تمام رموز سے آشنا کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ عربی زبان جانتا ہو اور قرآن کو پڑھے تو وہ اپنے آپ کو ملہم کے مقام پر کھڑا ہوا پاتا ہے۔ اس کو محسوس ہونے لگتا ہے گویا کہ خدا براہ راست اس سے مخاطب ہو گیا ہے۔ اس مقام کو پہنچنے کے بعد انسانی ساخت کے دوسرے علوم قرآن اور بندہ کے درمیان ایک قسم کی رکاوٹ بن جاتے ہیں، کجا کہ وہ قرآن کے معانی کو آدمی کے اوپر کھولنے کا ذریعہ بنیں۔

ترجمہ کی غلطی

علامہ سخاوی کی ایک کتاب ہے "القول البدیع فی الصلاۃ علی الحبیب الشفیع"۔ اس میں انھوں نے شیخ ابو الخیر اقطع کا ایک قصہ نقل کیا ہے۔ اس کا ترجمہ ایک اردو کتاب میں ان لفظوں میں کیا گیا ہے:

"شیخ ابو الخیر کہتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ میں آیا۔ وہاں پانچ دن قیام کیا۔ مجھ کو کچھ ذوق و لطف حاصل نہ ہوا۔ میں قبر شریف کے پاس حاضر ہوا، اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو سلام کیا۔ اور عرض کیا۔ اے رسول اللہ، آج میں آپ کا مہمان ہوں۔ پھر وہاں سے ہٹ کر منبر کے پیچھے سو رہا۔ خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ حضرت ابو بکر آپ کے داہنی طرف اور حضرت عمر آپ کے بائیں طرف تھے۔ حضرت علیؓ آپ کے آگے تھے۔ حضرت علیؓ نے مجھ کو بلایا اور فرمایا اٹھ، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ میں اٹھا اور حضرت کے دونوں آنکھوں کے درمیان چوما۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو ایک روٹی عنایت فرمائی۔ میں نے آدھی کھائی۔ اور جاگا تو آدھی میرے ہاتھ میں تھی۔

اس وقت ہمیں اس قصہ کی سند اور اس کی صداقت سے کوئی بحث نہیں۔ اس کو ہم نے صرف ایک ادبی مقصد کے تحت نقل کیا ہے۔ قصہ کا یہ جملہ "مجھ کو کچھ ذوق و لطف حاصل نہ ہوا"، ترجمہ کی غلطی ہے۔ اصل کتاب کے الفاظ یہ ہیں: اَقَمْتُ خَمْسَۃَ اَیَّامٍ مَا ذُقْتُ ذَوَاقاً۔ اس فقرہ کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا: میں پانچ دن رہا۔ مجھے ان دنوں میں کوئی چیز چکھنے کو بھی نہیں ملی۔

اس قسم کی غلطیاں اردو ترجموں میں بہت عام ہیں۔

الاسلام

صفحات ۲۴۰

قیمت مجلد مع پلاسٹک کور ۱۵ روپے۔ مجلد بغیر کور ۱۳ روپے

اسلام اور مسائل حاضرہ کا ایک جامع مطالعہ

اپنے موضوع پر اس نوعیت کی پہلی کتاب

ابواب :

جدید مسئلہ کیا ہے
حقیقت دین
ارکان اربعہ
صراط مستقیم
اسوۂ نبوت
تحریک اسلامی، سیرت کی روشنی میں
موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں
تعمیر ملت
دعوت الی اللہ
دعوت اسلامی کے جدید امکانات
آخری بات

الدار العلمیہ، جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

اخبار بلٹز کا تبصرہ

بلٹز (بمبئی) نے اپنی اشاعت ۱۰ ستمبر ۱۹۷۷ میں ایک مفصل مضمون شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے "پرانے چراغ اور الاسلام"۔ "پرانے چراغ" مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ہے اور "الاسلام" مولانا وحیدالدین خاں کی۔ مضمون کے شروع میں کہا گیا ہے کہ مسلم ممالک کو "پٹرول" کے ذریعہ جو اقتصادی قوت حاصل ہوئی ہے، "اس کا احساس تو انھیں ہو گیا۔ لیکن یہ شعور بیدار ہونا باقی ہے کہ پٹرول کی نہیں، ذہنی خوراک اور روحانی تسکین کی بھوکی دنیا کو دینے کے لئے ان کے پاس کیا ہے، اور وہ کیونکر صاف کر کے پیش کر دینا ہے، اس کے لئے کتنی زبردست مادی اور ذہنی تیاری کی ضرورت ہے۔"

اس تمہید کے بعد لکھا ہے "موضوع سخن ہے، ہندستان کے وہ علمائے اسلام اور ان کی تحریریں جو علمی دنیا میں اعتبار کا پایہ رکھتے ہیں۔ جو موجودہ دور کے مزاج شناس ہونے کے ساتھ ساتھ نسل حاضر سے محبت بھی رکھتے ہیں اور اسلام کا اصل جوہر پیش کرنے کی اہلیت بھی۔"

"پرانے چراغ" میں فاضل مصنف کے وہ اٹھارہ مضامین شامل ہیں جو انھوں نے اپنی مختلف معاصر شخصیتوں پر ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد لکھے۔ یہ مضامین جیسا کہ دیباچہ میں واضح کیا گیا ہے، ان شخصیتوں کے سوانح حیات کے طور پر نہیں لکھے گئے۔ یہ درحقیقت نقوش و تاثرات کا ایک مجموعہ ہے۔"

اس سلسلہ میں "پرانے چراغ" پر تبصرہ کرنے کے بعد بلٹز نے "الاسلام" پر مفصل اظہار خیال کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

اس قابل قدر تصنیف میں بے تکلف غور و فکر کی گمبھیر فضا موجود ہے

"مگر بات یہاں (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "پرانے چراغ" پر) تمام نہیں ہوتی۔ مولانا وحیدالدین خاں کی تصنیف الاسلام کا مطالعہ دوسرے پہلو سے ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ یہاں ادعائیت کی جگہ استدلال ہے اور حقیقتوں کو تسلیم کر لینے کا حوصلہ "دنیا کی امامت" کرنے کی لگن پر غالب ہے۔

مولانا وحیدالدین خاں بھی درجنوں باخبر علمار مشرق کی طرح دری اور بوریئے پر درس لے کر اٹھے اور عمر عزیز کے ۲۵ برس یوں گزارنے کے بعد، اور ۲۵ سال انھوں نے انگریزی زبان کی معرفت جدید علوم، خصوصاً فلسفہ اور تاریخ سے علم و خبر لینے میں صرف کئے۔ اس کا جلوہ ان کی تصنیف "الاسلام" میں نظر آتا ہے۔ اس تصنیف کی روح بھی لفظ "دعوت" میں پوشیدہ ہے۔

اس علمی اور غور طلب مختصر تصنیف کو اول تا آخر طالب علمانہ پڑھنے بلکہ نچوڑنے کے بعد تین نکات نکلتے ہیں۔

(۱) دین کے اصل منشا کی طرف پُرامن دعوت دی جائے (۲) وقت کا شاکلہ بدل چکا ہے (یہی لفظ شاکلہ، پوری کتاب کا مرکزی لفظ ہے) دنیائے اسلام

کے بڑے علما اور مجددین کو اس تبدیلی کا احساس ہی نہ ہوا۔ اور پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ شاکلہ سے مراد ذہنی ساخت ہے، جسے ہم روح عصر یا وقت کی پکار کہہ سکتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ سائنس کی ترقی نے ذہنی ساخت کا پرانا سانچا توڑ دیا ہے۔ آج حالات اسلام کی تبلیغ اور تصدیق کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔

"موجودہ زمانے میں الحاد کا شاکلہ توڑنے کے لئے بھی اسی قسم کی طویل اور عمیق جدوجہد درکار ہے، اس کے بغیر آج کی دنیا میں اسلام کو اس کی جگہ نہیں دلائی جاسکتی" صا۱۷

(۳) ہمیں اپنے زمانے کے علوم سے آگاہی اور مادی سروسامان سے پوری تیاری کے ساتھ "ارباب اقتدار سے غیر ضروری تصادم"، مول لئے بغیر جدید معیار کا تبلیغی اور اصلاحی کام کرنا چاہئے۔

مولانا الحاد کے جس شاکلہ سے لڑنے پر زور دیتے ہیں، وہ ان کی منطق کا لازمی نتیجہ نہیں۔ اس سے درگزر کر کے اس قابلِ قدر تصنیف "الاسلام"، میں بے تکلف غور و فکر کی گمبھیر فضا موجود ہے۔ خصوصاً اس کے ساتویں باب "موجودہ زمانے کی اسلامی تحریکیں" اور دسویں باب "جدید امکانات" میں۔

جب لائقی کا معیار خوشامد ہو جائے

حال میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے:

ALL THE PRIME MINISTER'S MEN

اس کے مصنف مسٹر جنار دن ٹھاکر ہیں۔ کتاب میں بڑے دلچسپ انکشافات کئے گئے ہیں۔ مثلاً بتایا گیا ہے کہ ۲۰ مارچ ۱۹۷۷ کے الکشن سے پہلے سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے تین بار سرکاری آدمیوں کے ذریعہ معلوم کرایا کہ الکشن کے سلسلہ میں عوام کا رجحان کیا ہے۔ پہلی رپورٹ ریسرچ اینڈ انالیسس ونگ نے پیش کی، جو ملک کی تمام ریاستوں کے جائزہ کے بعد تیار کی گئی تھی۔ شروع جنوری ۱۹۷۷ میں مسٹر اوم مہتا (اسٹیٹ منسٹر وزارت داخلہ) نے یہ رپورٹ سابق وزیر اعظم کے صاحبزادے مسٹر سنجے گاندھی کے سامنے رکھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ملک کی سیاسی فضا اس وقت مسز گاندھی کے حق میں سازگار نہیں ہے۔ مسٹر سنجے گاندھی اس کو دیکھتے ہی بگڑ گئے: "یہ لوگ کچھ نہیں جانتے۔ میں سارے ہندوستان میں گیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ سارا ملک اس وقت ہمارے ساتھ ہے" یہ کہہ کر انھوں نے رپورٹ کو رد کر دیا۔

دوسری بار کچھ اور لوگ چنے گئے اور ان کو تمام ریاستوں میں سیاسی جائزہ کے لئے بھیجا گیا۔ اس بار بھی رپورٹ ناموافق آئی اور سابق حکمراں گروہ کی طرف سے بدستور اس کو غلط قرار دے کر رد کر دیا گیا۔ اب تیسری بار زیادہ "لائق افراد"، جائزہ کے لئے چنے گئے۔ انھوں نے اپنی لیاقت کا ثبوت اس طرح دیا کہ چند ہی دن کے اندر رپورٹ پیش کر دی: "الکشن کے لئے یہ بہترین موافق وقت ہے" چنانچہ فوراً الکشن کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ معلوم ہے۔

تعریف کرنے والے کے مقابلہ میں وہ شخص کسی کا زیادہ بہتر ساتھی ہے جو نصیحت کرنے والا ہے۔ اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس کو جانتے ہوں۔ اور کوئی مرتبہ پانے کے بعد تو آدمی سب سے زیادہ جس حقیقت سے بے خبر ہو جاتا ہے وہ یہی ہے۔

فطرت کو اس کی تلاش کا جواب مل گیا

مسٹر الطاف گوہر پاکستان کے چوٹی کے صحافی ہیں۔ وہ پاکستان ٹائمس کے ایڈیٹر تھے۔ **بھٹو حکومت** (۷۷ - ۱۹۷۱) نے اپنے اقتدار کے ابتدائی زمانہ میں الطاف گوہر کو جیل خانہ میں ڈال دیا۔ جیل کا مطلب، سیاسی قیدیوں کے لئے، اپنے میدان عمل سے محرومی کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عام طور پر سب سے بہتر مشغلہ یہ رہ جاتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں مصروف کرلے۔ الطاف گوہر نے قرآن کو ترجمہ کی مدد سے پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ مطالعہ، حیرت انگیز طور پر، ان کے لئے ایک نیا تجربہ ثابت ہوا۔ وہ زندگی کی نئی وسعتوں سے آشنا ہوئے جس سے اب تک وہ، اپنی سیاسی مشاغل کی ہماہمی میں بے خبر رہے تھے۔ وہ شخص جس کا قلم چند دن پہلے تک عالمی سیاست کا جائزہ لیا کرتا تھا، جو اپنی خداداد ذہانت کے ساتھ قلم کا شہ سوار بنا ہوا تھا، جیل خانہ میں اس نے اپنے آپ کو اچانک بالکل بے بس پایا۔ اس کی دنیا ایک محدود کوٹھری تھی جہاں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

تنہائی کی زندگی، ہر معاملہ میں دوسروں پر انحصار، تمام ظاہری سہاروں کا رخصت ہو جانا، ان واقعات نے جیل کے ماحول کو الطاف گوہر کے لئے ایک عظیم حقیقت کے ادراک کی تربیت گاہ بنا دیا۔ ان کی فطرت، غیر ارادی طور پر، ایک ایسی ہستی کو تلاش کرنے لگی جو ہر طاقت سے بڑھ کر طاقت ور ہو۔ جس کو آدمی ہر آن پا سکتا ہو۔ جو ہر حال میں آدمی کی چٹان بن سکے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ حالات اس کو دھکیل کر ایسے مقام پر پہنچا دیں جہاں اس کے اپنے کمزور وجود کے سوا کوئی اس کے پاس نہ ہو، جہاں اس کے تمام سہارے اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہوں۔

اس نازک لمحہ میں جب مسٹر الطاف گوہر نے قرآن کی سورہ فاتحہ کھولی اور اس کو پڑھتے ہوئے اس فقرہ تک پہنچے: اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ، تو اچانک ان پر کھلا کہ وہ ہستی فی الواقع کائنات میں موجود ہے جس کی تلاش ان کی فطرت کا سب سے بڑا سوال بنی ہوئی تھی۔ سورہ کی آیت نمبر ۴ میں ان کو انسان کی حقیقی عظمت اور آزادی کا راز مل گیا۔ یہاں بندہ اپنے خدا کے ساتھ ایک ایسے ابدی عہد میں وابستہ نظر آیا جو مکمل طور پر اس کے عجز کا بدل بن جاتا ہے، جو اس کو ایک اتھاہ طاقت کی دائمی سرپرستی میں دے دیتا ہے۔ الطاف گوہر اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

I REMEMBER VIVIDLY THE MOMENT WHEN I FIRST REALIZED THE SIGNIFICANCE OF THIS VERSE. 'WE WORSHIP YOU ALONE, AND TO YOU ALONE WE TURN FOR HELP.IT WAS A DRAMATIC MOMENT OF FREEDOM, A MOMENT IN WHICH FEAR DISAPPEARED, AND WITHIN ME I FELT A RESURGENCE OF CONFIDENCE AND FAITH.

مجھے وہ لمحہ خوب یاد ہے جب کہ میں نے پہلی بار اس قرآنی فقرہ کی معنویت کو سمجھا "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہم صرف تجھی سے مدد چاہتے ہیں"۔ یہ آزادی کا ایک ڈرامائی لمحہ تھا، ایک ایسا لمحہ جس کے بعد خوف مٹ گیا، اور میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر ایک نیا اعتماد و یقین ابھر آیا ہے۔

عضویاتی ارتقار کا نظریہ

جو سائنسی حقیقت سے زیادہ

ایک سائنسی لطیفہ ہے

ذیل کی تصویر نیچرل ہسٹری میوزیم (تاریخ فطرت کے عجائب خانہ) سے لی گئی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ موجودہ انسان سے پہلے بن مانس کی شکل کی مخلوق زمین پر پائی جاتی تھی۔ اس سے ترقی کرتے کرتے موجودہ شکل وصورت کا انسان بن گیا۔ ایک آدمی اس طرح کے کسی چارٹ کو دیکھ کر بظاہر سمجھے گا کہ ارتقار فی الواقع کوئی تاریخی واقعہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تصویریں محض قیاسی ہیں۔ عالم واقعہ میں ان کا وجود ثابت نہیں۔

عضویاتی ارتقار کے مطابق زندگی کی مختلف شکلیں الگ الگ پیدا نہیں ہوئیں، بلکہ سب ایک ہی ابتدائی جرثومہ حیات کی مختلف ترقی یافتہ صورتیں ہیں جانوروں میں سے دودھ پلانے والے جانوروں کی بعض قسموں نے ترقی کرتے کرتے بالآخر بن مانس کی شکل اختیار کی۔ اس کے بعد لاکھوں برس تک مختلف انسان نما مخلوقات پیدا ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ انسان بنا جس کو ہم آج دیکھتے ہیں۔

اس نظریہ کی سب سے بڑی بنیاد متحجر ڈھانچے (FOSSILS) ہیں۔ قدیم زمانہ کی ذی حیات اشیار زلزلوں وغیرہ میں زمین کی تہوں میں دب گئیں۔ پھر مختلف کیمیاوی عمل سے ان کے پنجر پتھر کی شکل اختیار کر گئے۔ انھیں پتھرائے ہوئے اجزار کے ذریعہ قدیم زمانہ کے انسانوں کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔

اس نظریہ کے حق میں اگرچہ ابھی تک چند منتشر ہڈیوں کے سوا اور کوئی چیز نہیں ملی ہے، مگر نظریہ

From ape to man: Life-size restorations of (from left) Dryopithecus, Ra mapithecus, Australopithecus, Pithecanthropus, Neanderthal modern man at the Museum of Man in the Department of Anthropology, Panjab University, Chandigarh

ارتقا کے علمبرداروں کو اس پر اتنا یقین ہے کہ انھوں نے انھیں منتشر ہڈیوں کے ساتھ اپنے قیاس کا اضافہ کرکے انسانیت کی ایک مکمل ارتقائی تاریخ بنا ڈالی ہے۔

بعض اوقات چٹان میں دبی ہوئی ایک کھوپڑی ملتی ہے۔ پتھروں سے کاٹ کر نکالنے میں اس کے ریزے ریزے ہو جاتے ہیں۔ کئی ٹن سنگریزے اور مٹی کو چھاننے کے بعد جب "کھوپڑی" کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تلاش کرنے والوں کو کھوپڑی کا صرف ایک حصہ ملا ہے اور وہ بھی چار سو ٹکڑوں کی شکل میں۔

نظریۂ ارتقا کی تاریخ دلچسپ لطیفوں سے بھری ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر برطانی سائنس داں ٹی۔ ایچ۔ ہکسلے (۱۸۹۵ - ۱۸۲۵) اور جرمن پروفیسر ارنسٹ ہیکل (۱۹۱۹ - ۱۸۳۴) نے جب پہلی بار سمندر کی تہ کی کیچڑ کا معائنہ کیا تو انھوں نے پورے یقین کے ساتھ اعلان کر دیا کہ یہی وہ مادہ ہے جس سے زندگی کے ابتدائی جرثومہ کا آغاز ہوا۔

اس کے بعد ۱۸۷۰ میں جغرافی سوسائٹی نے اس مسئلہ کی علمی تحقیقات کی تو اس کو اعلان کرنا پڑا کہ یہ بالکل باطل ہے اس قسم کے مفروضہ کے لئے کوئی حقیقی قرینہ نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ علم الانسان کے ایک پروفیسر نے کہا کہ یہ خودفریبی (SELF DELUSION) کی ایک انوکھی مثال تھی۔

آسٹریلیا کے ساحل پر ماہرین کو ایک چٹان نظر آئی جہاں خالی اور ٹوٹی ہوئی سیپیوں کا ایک ڈھیر جمع تھا۔ انھوں نے سمجھا کہ وہ ایک ایسی قدیم تہذیب کی جائے وقوع پر پہنچ گئے ہیں جس کے لوگ زیادہ تر گھونگھوں پر گزارہ کرتے تھے۔ (یہ انسانی ارتقا کے ایک اہم مرحلہ کا انکشاف تھا) مگر بعد کی تحقیقات نے بتایا کہ یہ محض ایک غلط فہمی تھی۔ اصل یہ ہے کہ سمندری بگلوں کی ایک قسم ہے جس کی چونچ اتنی مضبوط نہیں ہوتی کہ وہ سیپ کو توڑ کر اندر دبا ہوا گھونگھا کھا سکے۔ آسٹریلیا کے ساحل پر سیپ بافراط پائی جاتی ہے۔ سمندری بگلا اس مشکل کا حل قدرت کے بتائے ہوئے طریقہ پر کرتا ہے۔ وہ سیپ کو اپنی چونچ میں پکڑ کر کافی بلندی تک جا کر ساحل پر واقع چٹانوں پر گرا دیتا ہے۔ نتیجہ میں سیپ ٹوٹ جاتی ہے اور گھونگھا باہر نکل آتا ہے جسے سمندری بگلا ایک ہی نوالے میں ہڑپ کر جاتا ہے۔ برسہا برس سے جمع شدہ خالی سیپیوں کے یہ ڈھیر جب ماہرین نے دیکھے تو انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ کسی قدیم تہذیب کا نشان ہے، حالاں کہ اس کا انسانی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ارتقا کے حامیوں کا خیال ہے کہ ارتقا کی سیڑھی پر چمپینزی (بن مانس) انسان سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ جنگل میں آزاد چمپینزی تقریباً ۲۰ قسم کی آوازیں نکالتا ہے جس سے مختلف قسم کے جذبات ــ خطرہ، غصہ، خوشی، پسند، نفرت، وغیرہ ــ کی ترجمانی ہوتی ہے۔ "چمپینزی کو تربیت دی جائے تو کیا وہ انسان جیسی آوازیں بھی نکال سکتا ہے۔" علمائے حیاتیات کے نزدیک اس کا جواب اثبات میں تھا۔ ان کے نزدیک چمپینزی کے حلق میں اس کی صلاحیت موجود تھی کہ اس کو بولنا سکھایا جا سکے۔ اسی طرح دوسری انسانی خصوصیات بھی۔

۱۹۴۷ میں فلوریڈا کی تجربہ گاہ میں ایک چمپینزی کو رکھا گیا۔ باقاعدہ منصوبہ کے تحت اس کو ایک تربیتی کورس سے گزارا گیا۔ مگر ساری کوشش کے بعد وہ صرف

حیاتیاتی حقائق نظریۂ ارتقا کے قیاسات کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں

چار الفاظ سیکھ سکا۔ اس قسم کی کوششیں پچھلے ۳۰ برسوں میں مسلسل کی جاتی رہی ہیں۔ مگر چمپینزی کے اندر انسانی اوصاف پیدا کرنے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

۱۹۶۷ میں اوکلاہاما یونیورسٹی میں کثیر رقم کے خرچ سے ایک جامع منصوبہ بنایا گیا اور سات چمپینزیوں کو غیر معمولی اہتمام کے ساتھ بالکل انسانی ماحول میں رکھ کر تربیت دی گئی۔ وہ کچھ وقت لیبورٹری میں گزارتے اور اس کے بعد پروفیسروں کے گھروں میں ان کے فرد خاندان کی طرح رہتے۔ ان کو انسانی کپڑے پہنائے جاتے۔ میز کرسی پر کھانا کھلایا جاتا۔ رات کو مسہریوں پر سلایا جاتا۔

انسان کے مفروضہ جدِ اعلیٰ (چمپینزی) کو انسانی آداب کے مطابق پانی پینے کی مشق کرائی جارہی ہے۔

صفائی ستھرائی کے تمام آداب سکھائے جاتے۔ مگر تربیتی کورس کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ بدستور "چمپینزی" تھے۔ ان کے اندر کوئی قابل لحاظ تبدیلی پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی ——— حیاتیاتی حقائق نے ارتقائی مفروضہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

پانڈیچری سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر ایک مقام ہے تروو کاری، یہاں قدیم زمانہ سے درختوں کے تنے کی شکل کے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ عوام کا خیال تھا کہ یہ بھوتوں یا راکششوں کی ہڈیاں ہیں جن کو کبھی وشنو بھگوان نے ہلاک کیا تھا۔ لوگ ان کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔

حال ہی میں ماہرین نے دریافت کیا کہ یہ دراصل فاسلس ہیں۔ یعنی قدیم زمانہ کے درختوں کے پتھرائے ہوئے تنے۔ اندازہ ہے کہ یہ درخت ۲۰ ملین سال پہلے پائے جاتے تھے۔ اس قسم کا ایک شجری فاسل نومبر ۱۹۷۵ میں نئی دہلی لایا گیا اور یہاں نیشنل میوزیم میں عام نمائش کے لئے رکھا گیا ہے۔

یہی صورت حال، بدلی ہوئی شکل میں، ارتقا پسندوں کے ساتھ پیش آئی ہے۔ انھوں نے بعض جزدی آثار پر اپنے قیاسات کا اضافہ کر کے ایک پورا حیاتیاتی نظریہ بنا لیا۔ مگر موجودہ زمانہ میں جس طرح عوامی توہمات ختم ہوتے چلے جارہے ہیں اسی طرح معلومات انسانی میں اضافہ اس "سائنٹفک قیاس" کی واقعیت کو بھی دن بدن مشتبہ کرتا جارہا ہے۔

اگرچہ اب بھی نصاب کی کتابوں میں قدیم نظریہ ہی پڑھایا جاتا ہے، مگر وہ دن دور نہیں جب ارتقا کے نظریہ کو تاریخ کی الماری کے سوا اور کہیں جگہ نہیں ملے گی۔

یہ ایک خدائی منصوبہ تھا

تاکہ ظالموں اور متکبروں کا مجرم ہونا ثابت ہو جائے اور اللہ کے وفادار بندوں کو خدائی گواہ بننے کا اعزاز حاصل ہو

ہجرت کے تیسرے سال احد کا معرکہ پیش آیا۔ اس جنگ میں ابتداءً مسلمانوں کو کامیابی ہوئی، مگر بعد کو اہل ایمان کی ایک اتفاقی غلطی سے فائدہ اٹھا کر خدا کے دشمن ان کے اوپر ٹوٹ پڑے اور انھیں نقصان پہنچایا۔ اس واقعہ سے اہل ایمان کے درمیان طرح طرح کے سوالات پیدا ہونے لگے۔ انھوں نے کہا: ہم حق پر ہیں پھر یہ مصیبت کہاں سے آگئی (آل عمران - ۱۶۵) جواب ملا کہ یہ وقتی نقصانات ہیں، ان کی پروا مت کرو۔ خدا کی نصرت حق پرستوں کے ساتھ ہے اور آخری کامیابی بہر حال انھیں کو حاصل ہوگی۔

"یہ اس واسطے ہوا تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم کو ظالموں کے اوپر گواہ بنائے ـــــ" (آل عمران - ۱۴۰) ـــــ گویا احد کی جنگ میں مسلمانوں سے جو ایک اتفاقی غلطی ہوئی اور جس کی وجہ سے خدا کے دشمنوں کو موقع ملا کہ وہ بے گناہ مسلمانوں کے اوپر پیچھے سے چڑھ آئیں، وہ بھی خدائی منصوبہ کا ایک جزو تھا۔ اس طرح خدا ظالموں اور سرکشوں کو ننگا کرنا چاہتا تھا، ان کے ہاتھوں اہل ایمان کو زخمی کر کے ان کی درندگی اور سرکشی کا ثبوت فراہم کرنا مقصود تھا۔ اللہ چاہتا تھا کہ اس واقعہ کے ذریعہ ایک طرف ظالموں اور متکبروں کو مجرمین کے کٹہرے میں کھڑا کر دے، دوسری طرف اپنے وفادار بندوں کو ان کے مقابلہ میں عدالت الٰہی کا گواہ بننے کا اعزاز عطا کرے۔ یہ ایک خدائی معاملہ تھا نہ کہ محض ایک انسانی واقعہ (۳۰ جولائی ۱۹۷۷)

انسان صرف اچھا یا برا کریڈٹ لے رہا ہے

ایک سب سے بڑی بات جس کو انسان سب سے زیادہ بھولا رہتا ہے، یہ کہ اس دنیا میں کسی انسان کو کوئی ذاتی طاقت حاصل نہیں۔ کوئی شخص نہ کسی کو کچھ دیتا، نہ کوئی شخص کسی سے کچھ چھینتا۔ ہر واقعہ جو اس زمین پر ہوتا ہے وہ خدا کی اجازت سے ہوتا ہے۔ انسان کی ساری حیثیت یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں امتحان کے لئے ہے۔ ارادہ کے سوا انسان کے بس میں اور کچھ نہیں۔ واقعات اس لئے اس کے سامنے لائے جاتے ہیں کہ اس کی جانچ ہو تاکہ اس کا خدا یہ دیکھے کہ اس کا بندہ مختلف رویوں میں سے کس رویہ کا اپنے لئے انتخاب کر رہا ہے۔ واقعات کا اہتمام مالک کائنات کی طرف سے ہوتا ہے۔ انسان تو صرف اچھا یا برا کریڈٹ لے رہا ہے

قرآن مالک کائنات کا فرمان ہے، جو اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ عزت کس کے لیے ہے اور ذلت کس کے لیے۔ کامیاب کون ہے اور نامراد کون۔ دنیوی اعتبار سے جب ہم کامیابی کا لفظ بولتے ہیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی سوسائٹی میں ایک شہری کو ترقی کے جو مواقع دیے گئے ہیں ان کو استعمال کرکے اونچے درجات تک پہنچنا۔ ایک شخص بڑا تاجر، اونچا عہدیدار اور اعلیٰ اعزازات کا مالک ہو تو اس کو کامیاب انسان کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماحول کے اندر تجارت کو بڑھانے کی جو ممکن صورتیں ہیں۔ اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے کے لیے جو صفات مقرر کی گئی ہیں، اعزازات کے حصول کے لیے جو راستے بنے ہوئے ہیں، وہ شخص ان کو عبور کر گیا ہے اور اپنی جدوجہد کے نتیجہ میں اس نے اس بلند مقام کو پالیا ہے جو قانون وقت کے تحت اس کے لیے ممکن تھا۔ کامیابی کے معنی الہ دین کا چراغ پالینے کے نہیں ہیں، بلکہ کامیابی اس واقعہ کا نام ہے کہ ایک شخص نے اپنی صلاحیت اور کام کے مواقع کو ان راہوں میں صرف کیا جو اس کے لیے کھلی ہوئی تھیں اور بالآخر اپنی کوششوں کے نتیجہ میں اس منزل تک پہنچ گیا جہاں ان راستوں کا کوئی چلنے والا پہنچتا ہے۔ کامیابی کوئی خوش قسمتی سے پیش آنے والا اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ وہ صحیح جدوجہد کا فطری نتیجہ ہے۔ اسی بات کو ایک مفکر نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے:۔

"لائق شخص اور کامیاب نہ ہو، یہ جھوٹ ہے"

یہی حال دوسری زندگی کی کامیابی کا بھی ہے جو انسان کی حقیقی منزل ہے، جہاں تمام اگلے پچھلے انسان اپنے رب کے حضور جمع کیے جائیں گے۔ اس دن عزت اور کامیابی ان لوگوں کے لیے ہوگی جو خدا کی رضا کو پالیں اور ذلت اور نامرادی ان کے لیے جو اس کی رضا کو حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ پہلے گروہ کے لیے دائمی عیش ہے اور دوسرے گروہ کے لیے دائمی عذاب۔ جو شخص قرآن پر ایمان لائے اور اسلام کو اختیار کرے وہ گویا پہلے انجام کا امیدوار ہے اور دوسرے انجام سے بچنا چاہتا ہے۔ مگر اس مقام بلند کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ ایک عظیم چڑھائی ہے جس کو عبور کرنے کے ایک لمبے عمل کے بعد آدمی اس کے اوپر پہنچتا ہے۔ خدا کا انعام کسی پڑی ہوئی چیز کی طرح محض اتفاق سے کسی کو نہیں مل جاتا، بلکہ دنیوی کامیابی کی طرح وہ ایک زبردست جدوجہد کا قدرتی نتیجہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق کسی شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ آخرت میں انسان کی کامیابی دراصل ایک لمبے امتحان سے پار اتر جانے کا دوسرا نام ہے۔ انسان کو پیدا کرکے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی دنیا میں ڈال دیا ہے جہاں طرح طرح کے باطل نظریات اور فاسد رجحانات ہیں جن سے اسے اپنے دل و دماغ کو پاک کرنا ہے۔ بہت سے غلط اور ناجائز طریقے ہیں جن سے اسے بچنا ہے۔ بہت سی شیطانی اور طاغوتی قوتیں ہیں جو انسان کو راہ حق سے پھیر دینے میں لگی ہوئی ہیں۔ ان طاقتوں سے

لڑتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ غرض دشواریوں سے بھرا ہوا ایک راستہ ہے جس کو طے کر کے اس کو اپنے رب تک پہنچنا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّھَوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّۃُ بِالْمَکَارِہِ (متفق علیہ)	جہنم لذتوں سے ڈھکی ہوئی ہے اور جنت تکلیفوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔

اسلام کی حقیقت کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو اس کے لیے "قربانی" سے زیادہ موزوں اور کوئی لفظ نہیں ہو سکتا۔ اسلام دراصل ایک زبردست جدوجہد ہے، وہ قربانی کا ایک مسلسل عمل ہے جو ایمان لانے کے بعد سے آدمی کی موت تک جاری رہتا ہے۔ سب سے پہلی قربانی آدمی اس وقت دیتا ہے جب وہ اپنے پسندیدہ خیالات اور قلبی رجحانات کو خیرباد کہہ کر دینِ حق کو قبول کرتا ہے۔ اس کے بعد دوسری قربانی وہ ہے جو عمل کی دنیا میں دی جاتی ہے۔ اخلاق و معاملات اور معیشت و تمدن میں وہ ان طریقوں کو چھوڑ دیتا ہے جو خدا کو ناپسند ہیں اور ان طریقوں کو اختیار کر لیتا ہے جو خدا کو محبوب ہیں۔ پھر جب وہ ان دونوں مرحلوں کو پار کر لیتا ہے تو وہ امتحان کے اس آخری میدان میں پہنچ جاتا ہے جہاں نہ صرف حرام چیزیں بلکہ زندگی کے جائز اثاثے بھی چھوڑ دینے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان بھی قربان کر دینی پڑتی ہے۔ یہ جان کی قربانی اس سلسلۂ امتحان کی تکمیل ہے اور عہد بندگی کو آخری طور پر ثابت کر دکھانا ہے جو ایمان لا کر آدمی نے اپنے رب سے کیا تھا۔

یہ تین دور جن سے گزر کر آدمی اپنے رب تک پہنچتا ہے اور اس کی رضا کا مستحق بنتا ہے، ان کو قرآن میں — ایمان - ہجرت اور جہاد — کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا :-

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَائِزُوْنَ ٥ (توبہ - ۲۰)	جو لوگ ایمان لائے، جنھوں نے ہجرت کی اور اپنی جانوں اور مالوں سے خدا کی راہ میں جہاد کیا ان کے لیے خدا کے یہاں بڑا درجہ ہے اور یہی لوگ دراصل کامیاب ہونے والے ہیں۔

اس آیت میں ایمان سے مراد ان حقائق کو تسلیم کرنا ہے جو قرآن میں تلقین کیے گئے ہیں، اور ہجرت سے مراد اس اعتراف اور اس کے تقاضوں کے خلاف جو کچھ ہے اس کو چھوڑ دینا، اور جہاد اس کوشش اور جدوجہد کا نام ہے جو ایمان اور مہاجرت کی زندگی کو آخری حد تک باقی رکھنے کے لیے اس دنیا میں آدمی کرتا ہے۔ اس طرح یہ ایمان، ہجرت اور جہاد — ایک دوسرے سے الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سلسلۂ سفر کی اگلی پچھلی منزلیں ہیں۔ یہ ایک ہی کیفیت کے مختلف ارتقائی مراحل ہیں جن کو ممیز کرنے کے لیے جدا جدا عنوان دے دیا گیا ہے۔ نیز ہجرت اور جہاد کی کوئی متعین صورتیں نہیں ہیں۔ ایمان کی حقیقت، مختلف حالات میں، مختلف صورتوں میں ظہور کرتی ہے۔ کسی کے لیے ہجرت ترکِ وطن کے ہم معنی ہوتی ہے، کسی کے لیے صرف یہ کہ وہ اپنے اندر کے برے رجحانات کو چھوڑ دے۔ کسی کا جہاد اس کو بیرونی قوتوں سے ٹکرا دیتا ہے جاتا

ہے۔ کسی کا جہاد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی داخلی ترغیبات کا مقابلہ کر کے اس کو زیر کرے۔

ایمان

سب سے پہلے ایمان کو لیجیے۔ یہ اس عظیم امتحانی مہم میں شریک ہونے کا فیصلہ کرنا ہے جس کی ابتدا زبان کے اقرار سے ہوتی ہے اور جس کی انتہا یہ ہے کہ اسی پر قائم رہتے ہوئے آدمی اپنی جان دے دے یہ وہ عہد ہے جو بندہ اپنے خدا سے اس بات کے لیے کرتا ہے کہ وہ ساری عمر اس کا وفادار رہے گا۔ ایمان اس کیفیت کا نام ہے جو حقیقت کے صحیح اور مخلصانہ شعور سے پیدا ہوتی ہے۔ جب آدمی اس حیرت انگیز کائنات کے پیچھے ایک لامحدود قوت کا مشاہدہ کر لیتا ہے، جب وہ خدا کے رسولؐ کو تسلیم کر کے اس کے تمام فیصلوں پر راضی ہو جاتا ہے، جب اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ تخلیق کا یہ عظیم منصوبہ بے مقصد نہیں ہے بلکہ ایک ایسا دن آنے والا ہے جب ماضی اور مستقبل کے تمام انسانوں کو جمع کر کے ان کا حساب لیا جائے، تو اسی کیفیت کے مجموعہ کو ہم ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایمان کی اصل روح اعتماد کرنا ہے۔ یہ اعتماد ایک ایسی ہستی کے بارے میں ہوتا ہے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔ اس لیے اس میں یقین کا مفہوم پیدا ہوا۔ اسی طرح خدا کو اس کی تمام صفات کے ساتھ ماننے کے لازم معنی یہ ہیں کہ اس کے غضب سے ڈرا جائے اور اس کے عذاب سے بچنے کی فکر کی جائے اس لیے اس کے ساتھ تقویٰ اور خوف کا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح اگر قرآن کے تصور ایمان کی تشریح کے لیے تین الفاظ — یقین، اعتماد اور خوف — کو اکٹھا کر دیں تو ہم اس کی روح کے بالکل قریب پہنچ جاتے ہیں۔ ایمان اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے خدا اور اس کے رسولؐ پر اس کلّی اعتماد کا نام ہے جو یقین کامل سے پیدا ہوتا ہے، اور خدا سے اس خوف کا نام ہے جو آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ کسی پولیس اور فوج کے تسلط کے بغیر خود سے اس کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لے۔

یہ یقین جو ایمان کا پہلا جزو ہے، یہ خارج سے درآمد کی ہوئی کسی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کا زندہ شعور ہے جو خود انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی ہے۔ انسان کائنات پر غور کرتا ہے۔ رسولؐ کی تعلیمات کو دیکھتا ہے اور اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز پر کان لگاتا ہے تو یہ تینوں چیزیں بالکل ایک معلوم ہوتی ہیں۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی ایک ہی پیغام ہے جو ایک وقت میں تین مختلف مقامات سے نشر ہو رہا ہے۔ خدا کا رسولؐ جس حقیقت کی خبر دیتا ہے، کائنات پوری کی پوری بالکل اس کی ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے اور انسان کی اندرونی آواز ہمہ تن اس کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ کتاب الٰہی میں جو کچھ پڑھتا ہے زمین و آسمان کے اندر اسی کو دیکھتا ہے اور جو کچھ پڑھتا ہے اور دیکھتا ہے اس کی فطرت اس کو اس طرح قبول کر لیتی ہے جیسے کسی خانے میں بالکل اسی سائز کی چیز رکھ دی گئی ہو۔ مگر یقین کی یہ کیفیت کسی کو خود بخود حاصل نہیں ہوتی۔ جس طرح فطرت کی ہر صلاحیت اسی وقت ردبکار آتی ہے جب اس کو نشو و نما دے کر

ابھارا جائے، کائنات کا ہر راز اسی وقت انسان کے اوپر بے نقاب ہوتا ہے جب اس کی تلاش میں وہ اپنے آپ کو گم کر چکا ہو۔ اور کسی کتاب کے مضامین اسی وقت آدمی پر کھلتے ہیں اور اسے فائدہ پہنچاتے ہیں جب اس کا گہرا مطالعہ کر کے اس کے مطالب کو اخذ کیا جائے۔ ٹھیک اسی طرح یہ یقین بھی آدمی کو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ اپنی قوت ارادی کو اس کے لیے کام میں لائے۔ یہ اگرچہ کائنات کی واضح ترین حقیقت ہے مگر اس دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ آدمی کو وہی کچھ ملے جس کے لیے اس نے جدوجہد کی ہو۔

ایمان کا دوسرا جزو اعتماد ہے۔ اپنی ذات اور کائنات کا مطالعہ جہاں آدمی کو ایک طرف یہ بتاتا ہے کہ ایک علیم خالق اور کارساز ہے جو اس کارخانے کے تمام واقعات کا حقیقی سبب ہے۔ اسی کے ساتھ اور عین اسی وقت اس کو دو اور باتوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ایک اپنی انتہائی بے چارگی کا اور دوسرے خدا کے بے پایاں احسانات کا۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے وجود کے لیے بے شمار چیزوں کا ضرورتمند ہے۔ مگر وہ کسی ایک چیز کو بھی خود سے نہیں بنا سکتا۔ وہ ایک کمزور بچہ کی شکل میں پیدا ہوتا ہے اور بڑھاپے کی ناتوانیوں کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی زمین کے اوپر کھڑا ہے جو فضا کے اندر معلق ہے جس کے توازن میں معمولی بگاڑ بھی آ جائے تو اس کو تباہ کر دینے کے لیے کافی ہے، وہ اپنے کو ایک ایسی عظیم کائنات کے اندر گھرا ہوا پاتا ہے جس پر اسے کوئی اختیار نہیں۔ ان حالات میں اس کو اپنا وجود بالکل بےبس اور حقیر معلوم ہونے لگتا ہے۔ دوسری طرف وہ دیکھتا ہے کہ وہ سب کچھ جس کی اسے ضرورت تھی، اس کے لیے مہیا کر دیا گیا ہے۔ اس کو ایسا جسم دیا گیا ہے جو دیکھتا ہے، جو سنتا ہے، جو بولتا ہے، جو سوچتا ہے اور اس کی قوتوں کو برقرار رکھنے کے لیے ایک خود بخود چلنے والی مشین کی طرح مسلسل کام کر رہا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ زمین و آسمان کی ساری قوتیں پوری ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ اس کو اپنا وجود مجسم احسان نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے اندر بے پناہ جذبۂ شکر امنڈتا ہے اور وہ احسان مندی کے جذبہ سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ اس ہستی کو اپنا سب کچھ قرار دے جس نے یہ سارا انتظام اس کے لیے کیا ہے پہلی چیز اس کو اپنی مکمل بے بسی کا یقین دلاتی ہے اس کو شدید احساس ہوتا ہے کہ کوئی بلند تر قوت ہو جو اس کی دستگیری کرے۔ اور دوسرا احساس اس کی اس طلب کا جواب بن کر سامنے آتا ہے۔ جو مطالعہ اس کو اپنے اندر خلا کا احساس دلاتا ہے وہی مطالعہ بیک وقت اس خلا کو پر بھی کر دیتا ہے۔

ایمان کا تیسرا جزو "خوف" ہے۔ یہ خوف ایمان کے ابتدائی دو اجزاء۔ یقین اور اعتماد سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ اور اس کی تکمیل ہے۔ ایک طرف وہ خدا کو دیکھتا ہے جو عدل و حکمت کا خزانہ ہے۔ دوسری طرف کائنات کو دیکھتا ہے تو اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ اتنا بڑا تخلیقی منصوبہ بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ پھر جب وہ زمین پر بسنے والے انسانوں کو دیکھتا ہے جن میں ظالم بھی ہیں اور مظلوم بھی۔ اچھے

بھی ہیں اور برے بھی، تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ محاسبہ کا ایک دن آنا ضروری ہے جہاں سچوں کو ان کی سچائی کا اور بروں کو ان کی برائی کا بدلہ دیا جائے۔ رب العالمین پر اعتماد ہی اس کے لیے رب العالمین سے خوف کی بنیاد بن جاتا ہے۔

یہ خدا کا خوف اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو کسی ڈراؤنی چیز کو دیکھ کر آدمی کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو کسی بھی ایک لفظ سے صحیح طور پر تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ انتہائی امید اور انتہائی اندیشہ کی ایک ایسی ملی جلی کیفیت ہے جس میں بندہ کبھی یہ طے نہیں کر پاتا کہ دونوں میں سے کس کو فوقیت دے۔ یہ سب کچھ کر کے اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کا وہ اعلیٰ ترین احساس ہے جس میں آدمی کو صرف اپنی ذمہ داریاں یاد رہتی ہیں اور اپنے حقوق کو وہ بالکل بھول جاتا ہے۔ یہ محبت اور خوف کا ایک ایسا مقام ہے جس میں آدمی جس سے ڈرتا ہے اسی کی طرف بھاگتا ہے، جس سے چھننے کا خطرہ محسوس کرتا ہے اسی سے پانے کی بھی امید رکھتا ہے یہ ایک ایسا اضطراب ہے جو سراپا اطمینان ہے اور ایسا اطمینان ہے جو سراپا اضطراب ہے۔

یہ ایمان کے تین نمایاں پہلو ہیں۔ ایمان دراصل اس کیفیت کا نام ہے جو خدا کے خوف، اس پر مکمل اعتماد اور اس کے بارہ میں کامل یقین سے پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالےٰ پر، اس کے رسولوں پر اور اس کے احکام پر ایمان لائے، اپنا سب کچھ اس کو سونپ دے، اس کے تمام فیصلوں پر راضی ہو جائے، وہ مومن ہے۔ ایمان عقل کے لیے ہدایت اور روشنی ہے اور دل کے لیے طہارت اور پاکیزگی۔ اس لیے یہ عقل اور ارادہ دونوں کو ایک ساتھ متاثر کرتا ہے اور خیالات و اعمال سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ قرآن کی زبان میں مومن وہ شخص ہے جو خدا کا خالص اور وفادار بندہ ہے اور اس کے احکام پر یقین و اعتماد کی ساری کیفیات کے ساتھ اطاعت کا معاہدہ کرتا ہے۔

ہجرت

اب ہجرت کو لیجیے ــــ ہجرت کے معنی ہیں چھوڑنا۔ ترک تعلق کرنا۔ عام طور پر ہجرت کو ترک وطن کے ہم معنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ یقیناً ہجرت کا لفظ مخصوص طور پر جس واقعہ کے لیے بولا جاتا ہے وہ یہی ہے مگر کسی واقعہ کو اس کے پس منظر سے الگ کر کے سمجھا نہیں جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ترک وطن جو مومن کی زندگی میں پیش آتا ہے یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتا بلکہ ایک لمبی تاریخ کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو مومن کی زندگی میں پہلے دن سے شروع ہوتا ہے اور بالآخر ترک علائق تک پہنچ جاتا ہے۔

اللہ تعالےٰ کے فضل سے ایک شخص پر حق کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ اٹھ کر لوگوں کو اس کی طرف بلانا شروع کر دیتا ہے، وہ وقت کے خلاف ایک نئی آواز کا علمبردار بن کر گویا یہ اعلان کرتا ہے کہ اس نے ماحول کی بندگی چھوڑ دی ہے اور زمانہ کے خلاف اپنے لیے ایک راہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے، یہ ہجرت کا آغاز ہے جب

آدمی ناجائز زندگی کو چھوڑ کر جائز زندگی کو اپنانے کا عزم کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک مسلسل جدوجہد شروع ہو جاتی ہے جس میں اس کو بہت سی پرانی چیزوں کو چھوڑنا اور بہت سی نئی چیزوں کو اختیار کرنا ہوتا ہے۔ کتنے ہی اپنے لوگوں سے کٹنا اور کتنے ہی غیروں سے جڑنا ہوتا ہے۔ اندر سے باہر تک بے شمار پسندیدہ چیزوں کو ترک کرنا اور اس کے بجائے دوسری ناخوش گوار چیزوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ایمان لانے کے ساتھ ہی مومن کی زندگی میں ہجرت ۔ ایک نیا طرزِ عمل اختیار کرنے کے لیے بہت سی پرانی چیزوں کو چھوڑنے کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ یہ ہجرت جو اس نے خود کی ہے دوسروں کو بھی اسی کی طرف بلانا شروع کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں کچھ لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں اور کچھ مخالف بن جاتے ہیں۔ اس طرح ماحول میں دو بالکل مقابل گروہ ابھرنے لگتے ہیں جن میں سے ایک گروہ اس چیز سے چمٹا ہوا رہتا ہے جس کو دوسرا اگر وہ چھوڑ دیا جاتا ہے
یہ اختلاف صرف اس پہلو سے نہیں ہوتا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر تنقید کرتا ہے اور اس کے رویہ کو غلط قرار دیتا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دونوں کے درمیان ایک عملی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ انسانی معاشرہ ایک وحدت ہے جس میں کوئی شخص دوسرے تمام لوگوں سے الگ اپنے لیے کوئی راہ نہیں بنا سکتا۔ انسان اپنی عین فطرت کے اعتبار سے سماجی واقع ہوا ہے۔ اس کی تمام ضرورتیں دوسروں سے مل جل کر انجام پاتی ہیں اور اس کو دوسروں کے پھیلائے ہوئے نظریات کے درمیان زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ کوئی شخص اپنے پسند کیے ہوئے نظریہ کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ سماج کے تمام اداروں میں اسی نظریہ کو رائج نہ کر لے۔ اس کے بغیر نہ تو وہ مدرسہ میں اپنی مرضی کے مطابق تعلیم حاصل کر سکتا نہ بازار میں اپنی مرضی کے مطابق خرید و فروخت کر سکتا۔ نہ عدالتوں سے اپنے اصول کے مطابق فیصلے لے سکتا۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہیں کر سکتا کہ جس چیز کو وہ حلال سمجھتا ہے اسے کھائے اور جو چیزیں اس کے نزدیک حرام ہیں ان کو اپنے حلق کے نیچے اترنے نہ دے۔ اس لیے جب کوئی شخص وقت کے خلاف کسی مسلک کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ لازمی طور پر ان لوگوں سے ٹکراؤ کا سبب بن جاتا ہے جن کے بنائے ہوئے نظام کے اندر وہ زندگی گزار رہا ہے۔ انسانی معاشرہ کی مثال ایک جال کی سی ہے جس کے تمام افراد حلقوں کی مانند ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک حلقہ کو الگ کرنے کی کوشش پورے جال کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ اس طرح ایک مستقل اختلاف شروع ہو جاتا ہے جو دن بہ دن نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ قدم قدم پر ایک دوسرے سے مزاحمت پیش آتی ہے جس میں برسرِ اقتدار طبقہ اہلِ حق کو ستانے اور ان کو ذرائع حیات سے محروم کرنے کی ساری تدبیریں کرتا ہے۔ دونوں طرف سے شدت بڑھتی چلی جاتی ہے ایک طرف مظالم کی شدت۔ دوسری طرف یہ شدت کہ سب کچھ سہیں گے مگر اپنے عزم کو ترک نہیں کریں گے۔ جس چیز کو غلط سمجھ کر ایک بار چھوڑ چکے ہیں اس کی طرف دوبارہ واپس نہیں جائیں گے۔ یہ کشمکش بالآخر ایک ایسے نقطے پر پہنچ جاتی ہے جہاں معاشرہ حق پسندوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور یہ فیصلہ

کرتا ہے کہ ان کے وجود کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ اس وقت اہل حق یہ طے کرتے ہیں کہ اس بستی کو چھوڑ کر زمین کے کسی دوسرے ٹکڑے میں چلے جائیں۔ پہلے انھوں نے غلط خیالات اور حرام معاملات کو ترک کیا تھا۔ اب وہ اپنے مکان، اپنی جائیداد اپنے عزیزوں، غرض ساری متاعِ حیات کو چھوڑ دیتے ہیں یہ ہجرت کی آخری اور انتہائی شکل ہے۔

اس ہجرت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک مقام کو چھوڑ کر آدمی دوسرے مقام پر چلا گیا۔ بلکہ یہ باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف بڑھنا ہے۔ یہ شیطان اور طاغوت کی بندشوں سے نکل کر خدا کی طرف بھاگنا ہے۔ چنانچہ قرآن و حدیث میں مومنین کی ہجرت کو "ہجرت الی اللہ" کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کی طرف ہجرت۔ ایسا کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ لوگ زمین کو چھوڑ کر آسمان پر نہیں چلے جاتے بلکہ اسی دنیا میں رہتے ہیں، ایسا کہنے کی وجہ یہ ہے کہ چھوڑنے کا یہ عمل خدا پرستی کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ خدا کی طرف ہجرت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جو کچھ مانع آئے؛ جو چیز بھی اس کی طرف بڑھنے میں رکاوٹ بنے اس کو چھوڑ دینا۔ یہ خدا پرستانہ زندگی کی بنیاد ہے جب تک آدمی اس ہجرت کے لیے تیار نہ ہو وہ ایمان کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ اپنی زندگی کو اسلامی زندگی بنانے میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو اس قربانی کے لیے تیار ہو۔ جب وہ دیکھے کہ اس کے اندر ایسے افکار اور رجحانات پرورش پا رہے ہیں جو خدا کی مرضی کے خلاف ہیں تو انھیں کھرچ کر نکال دے۔ اگر وہ غلط اعمال میں مبتلا ہو تو انھیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے۔ کسی کا تعلق دین کی طرف کھل کر آنے میں روک بن رہا ہو تو ایسے تعلق کو خیرباد کہہ دے۔ کسی معیار زندگی کو برقرار رکھنے کا مسئلہ دین کے کام میں اپنا حصہ ادا کرنے کا موقع نہ دیتا ہو تو ایسے معیار زندگی کو دفن کر دے۔ دین کے تقاضے پورے کرنے میں معاشی خوشحالی کو خطرہ لاحق ہو تو اس کو گوارا کر لے۔ اپنے آپ کو خدمت دین کے لیے وقف کرنے میں اپنا اور بچوں کا مستقبل تاریک نظر آتا ہو تو اس کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھ جائے۔ غرض ہر بار جب آدمی کسی ایسی حالت میں مبتلا ہو کہ ایک طرف خدا بلا رہا ہو اور دوسری طرف کوئی دوسرا تقاضا آدمی کو کھینچ رہا ہو تو دوسرے تقاضوں کو چھوڑ کر خدا کی طرف بڑھ جانا — اسی کا نام ہجرت الی اللہ ہے۔

اس ہجرت کے بہت سے مراحل اور اس کی بے شمار قسمیں ہیں مگر اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے ہم اس کو دو بڑے عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک ناجائز اور حرام چیزوں کو چھوڑنا اور دوسرے ان چیزوں کو چھوڑنا جو فی نفسہ قابل اجتناب نہیں ہیں۔ مگر دین کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں ایسے مراحل آتے ہیں کہ مومن کو ان سے بھی دست بردار ہونا پڑتا ہے۔

ہجرت کی پہلی قسم میں خیالات اور اعمال کی وہ پوری فہرست آتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام اور قابل ترک قرار دیا ہے ہر آدمی کسی ماحول میں پیدا ہوتا ہے ماحول نام ہے تاریخ، روایات، عادات اور چال چلن کے ایک مخصوص ڈھانچہ کا۔ یہ افکار و اعمال کا ایک نظام ہے جو زندگی کے تمام گوشوں پر چھایا ہوا

رہتا ہے۔ جس طرح زمین کے گولے کے گرد ہوا کا ایک غیر مرئی غلاف ہے جس میں ہم سب لوگ ڈوبے ہوئے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہر پیدا ہونے والا اپنے وقت کے ماحول میں ڈوبا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ اسی کے اندر اس کی نشو ونما ہوتی ہے۔ ماحول کے افکار اور روایات اس کی رگ رگ میں پیوست ہو جاتے ہیں، اور اکثر اوقات ان کے خلاف سوچنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے جب آدمی پر حق کا انکشاف ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس "دینِ آباء" کو چھوڑنے کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ اس کو ان تمام غلط اثرات کو کھرچ کر اپنے اندر سے نکال دینا ہوتا ہے جو ماحول کے اثر سے اس نے قبول کر رکھے تھے۔ پھر ہر آدمی کے اندر ایک نفس ہوتا ہے، یہ نفس صرف لذتوں کو ڈھونڈتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرنے کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ صحیح ہے یا غلط، اچھی ہے یا بری۔ بلکہ اس کے نزدیک پسندیدگی کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ اسے اچھی لگتی ہے اور اس کے ذریعے سے اس کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ آدمی اپنی جاہلی زندگی میں بہت سی ایسی دلچسپیوں اور مشغولیتوں کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے جو اگرچہ غلط ہیں مگر اس کے نفس کو پسند آتے ہیں۔ اسی طرح وہ بہت سی ایسی ذمہ داریوں کو بھلا دیتا ہے اور انھیں ترک کر دیتا ہے جو اگرچہ اخلاقاً اس کے لیے ضروری ہیں، مگر اس کے نفس کو پسند نہیں آتیں۔ اس لیے جب کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو اس کو اپنی زندگی میں شکست و ریخت کا ایک مستقل عمل جاری کرنا پڑتا ہے، بہت سی چیزیں جو اس کو پچھلی زندگی میں نہایت عزیز تھیں انھیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے، اور بہت سی چیزیں جن سے اسے نفرت تھی، جن سے اسے کوئی دلچپی نہیں تھی، ان کو اپنی زندگی میں شامل کرنا ہوتا ہے، اس طرح ایمان لانے کے بعد غلط جذبات، غلط تعلقات، اور غلط اعمال سے جدائی کی ایک مستقل مہم شروع ہو جاتی ہے زندگی کے تمام معاملات میں ناجائز طریقوں سے بچنے کا ایک پیہم عمل کرنا ہوتا ہے جو موت کی آخری گھڑی تک جاری رہتا ہے یہ ہجرت کی پہلی اور ابتدائی قسم ہے جو ماضی کے غلط عادات و اطوار سے اپنے کو پاک کرنے اور آئندہ اس طرح کی کوئی چیز قبول نہ کرنے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس ہجرت کا ذکر قرآن میں سورہ مدثر میں کیا گیا ہے جو نبوت کے بالکل ابتدائی زمانے کی سورہ ہے۔ فرمایا

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (مدثر۔ ۵) گندگی سے ہجرت کر یعنی خیال اور عمل کی تمام برائیوں کو چھوڑ دے

یہی بات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل الفاظ میں واضح فرمائی ہے۔

اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ۔ مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔

یہ ہجرت الی اللہ کا ایک پہلو ہے جس میں آدمی کو تمام ناجائز چیزیں چھوڑ دینی ہوتی ہیں۔ خدا کی مرضی کے مطابق بننے کے لیے ان چیزوں سے اپنے کو پاک کرنا ہوتا ہے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جس میں آدمی مجبور ہوتا ہے کہ اپنے جائز مفادات بھی خدا کی راہ میں قربان کر دے۔ ایسا اس لیے ہے کہ اسلام آدمی کو کرنے کا اتنا بڑا کام دے دیتا ہے کہ اس کے بعد پھر اسے کچھ اور کرنے کا موقع باقی نہیں رہتا۔ اس کی توجہات اپنی ذات سے ہٹ کر ہمہ تن اسلام کی طرف لگ جاتی ہیں۔ اسی

لیے کہا گیا ہے کہ دنیا کے اندر مومن کی صرف ذمہ داریاں ہیں۔ یہاں اس کا کوئی حق نہیں ہے اس کا جو کچھ حق ہے وہ خدا کے یہاں ہے اور وہیں وہ اسے پائے گا۔

اسلام کو قبول کرنے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں اس کو اختیار کر لے۔ بلکہ عین اسی کے ساتھ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں کو اس کی طرف بلائے اور پورے معاشرہ میں اس کو قائم کرنے کی جدوجہد کرے۔ دین کا یہ دوسرا تقاضا ہماری ذمہ داری کو صرف دگنا نہیں کرتا بلکہ اس کو انتہائی حد تک دشوار بنا دیتا ہے۔ اگرچہ انفرادی زندگی میں ممکن حد تک دین کو اختیار کرنا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ یہ فتنوں سے بھری ہوئی دنیا میں اپنے اختیار اور اپنے ارادہ کو صرف صحیح سمت میں استعمال کرنا ہے۔ یہ خود مختار ہو کر اپنی مرضی سے اپنے آپ کو پابند بنا لینا ہے اور موت کی آخری گھڑی تک پابند بنائے رکھنا ہے۔ مگر دین کا دوسرا تقاضا — یعنی دوسرے بندگان خدا تک خدا کے پیغام کو پہونچانا اور اس کے دین کو عملاً زمین کے اوپر رائج کرنے کی جدوجہد کرنا — یہ اتنا گراں بار تقاضا ہے کہ اس کا تصور بھی آدمی کو لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم اور جاں گسل کام ہے جو اس کی ساری قوت اور اس کا سب کچھ مانگتا ہے۔ دعوتِ حق اور اشاعتِ دین کے علاوہ کسی کام میں وہ جتنا وقت اور قوت بھی صرف کرے گا اس کے معنی یہ ہیں کہ اسی کے بقدر وہ اصل فریضہ کی ادائیگی میں کمی کر رہا ہے۔

آدمی جب اس حیثیت سے دین کو قبول کرتا ہے تو وہ فوراً محسوس کرتا ہے کہ اس کام میں اپنا حصہ ادا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ میں اور کچھ نہ کروں۔ وہ اپنے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں پاتا کہ اپنی ضرورتوں کو انتہائی حد تک مختصر کر دے۔ دنیا کے اندر اپنی تمناؤں کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دے اور اپنی ذات کے لیے کم سے کم مصروف رہ کر حق کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ بالکل ناگزیر ضروریات کی فراہمی کے بعد جو وقت بھی ملے اس کو شہادت دین کی راہ میں لگا دے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کو اپنی انفرادی زندگی میں اختیار کرنا ہو تو صرف حرام چیزوں کو چھوڑ کر بھی کوئی شخص "دیندار" بن سکتا ہے مگر اسلام کو اجتماعی زندگی میں قائم کرنے کی مہم شروع کیجیے تو آپ کو بہت سی حلال چیزوں سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا۔ اس کے بغیر صحیح طور پر اس کام کی ابتدا بھی نہیں کی جا سکتی۔ اس کو انجام تک پہنچانا تو بہت دور کی بات ہے۔

پہلی صورت میں آدمی کے اوپر صرف اس کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے اور دوسری صورت میں وہ ساری خلق تک پیغام حق پہنچانے کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔ یہ چیز آپ کی مصروفیتوں اور دقتوں میں بے پناہ اضافہ کر دیتی ہے اس کا تقاضا ہے کہ آپ اسلام کے برحق ہونے اور اس کے سوا دوسرے تمام افکار و نظریات کے ناحق ہونے کا بے پناہ یقین پیدا کریں تاکہ آپ اس کے پرجوش مبلغ بن سکیں۔ آپ کو اسلام کا تفصیلی علم حاصل کرنا ہے تاکہ دوسروں کے سامنے اس کو واضح انداز میں پیش کر سکیں۔ آپ کو ان غلط افکار و نظریات کے خلاف دلائل فراہم

کرنے ہیں جنھوں نے انسانی ذہنوں کو متاثر کر رکھا ہے تاکہ باطل کو چھوڑ کر لوگوں کو حق کی طرف آنے پر آمادہ کیا جاسکے۔ آپ کو ایک ایک شخص تک پہنچنا ہے اور اس کی نفسیات، اس کے حالات اور اس کی قوتِ فہم کے مطابق اسے بات سمجھانی ہے۔ آپ کو اسلامی اخلاق کا نہایت اعلیٰ نمونہ بننا ہے تاکہ آپ کی زندگی آپ کے دعوے کی تردید کرنے والی نہ ہو بلکہ اس کی صداقت پر گواہ ہو۔ غرض فرائض کی ایک عظیم فہرست ہے جو آپ سے آپ کی پوری عمر اور آپ کا پورا اثاثہ مانگتی ہے۔ پھر ایسے فرض کو ادا کرنے کی ذمہ داری اوڑھنے کے بعد کسی دوسری چیز میں دلچسپی لینے کا موقع کہاں باقی رہتا ہے۔

یہ ہجرت کی دوسری قسم ہے یعنی دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنی ذات کے تقاضوں کو چھوڑ دینا جب دین کی ضروریات اور اپنی ضروریات میں ٹکراؤ ہو، جب دین کا کام آپ سے آپ کا پورا وقت اور آپ کی ساری صلاحیتیں مانگتا ہو۔ جب دین کا تقاضا یہ ہو کہ آپ اپنی خوشی اپنا آرام اور اپنے عزیز و اقارب تک کو چھوڑ کر اس کی طرف بڑھیں تو آپ اپنا سب کچھ اس کے لیے قربان کر دیں اور کوئی چیز بھی ایسی نہ ہو جس کا تعلق آپ کو دین کی طرف جانے میں روک بن جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو مندرجہ ذیل آیت میں بیان کی گئی ہے۔ مومن، مہاجر اور مجاہد فی سبیل اللہ کے بلند درجات کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ٥

(توبہ — ۲۴)

اے نبی کہہ دو، اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری کے لوگ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے ماند پڑنے کا تمہیں ڈر لگا رہتا ہے اور مکانات جو تم کو پسند ہیں اگر یہ تم کو خدا اور رسول سے زیادہ محبوب ہیں اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے مقابلہ میں تم کو ان چیزوں سے زیادہ شیفتگی ہے تو انتظار کرو، یہاں تک کہ خدا کا فیصلہ آجائے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اس آیت میں جن چیزوں کا ذکر ہے وہ سب کی سب اصلاً جائز ہیں اور ان میں سے کوئی بھی فی نفسہٖ حرام نہیں ہے مگر مومنین سے کہا گیا ہے کہ ان سب کو چھوڑ کر خدا کی طرف بڑھیں اور جو لوگ ایسا نہ کریں وہ فاسق (یعنی عہد شکن) قرار دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مطالبہ ہمارے پیش رو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے کیا تھا جنھوں نے نبی آخر الزماں کے ذریعہ اپنے رب سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ دین کو سربلند کرنے کی جدوجہد میں اپنی ساری قوت لگا دیں گے۔ جب صحابہ کرام کے اس عہد پر بیس سال کی مدت گزر گئی اور انھوں نے مسلسل قربانیوں کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ دین کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہیں تو غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ۹ھ میں اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ان کی کوششوں کی قبولیت کا اعلان فرمایا:-

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

(توبہ ـــــ ۱۱۱)

اللہ نے مومنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے رہتے ہیں، کبھی مارتے رہتے ہیں اور مارے جاتے رہتے ہیں۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، تورات میں، انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔ بس خوش ہو جاؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے کیا ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

یہ ہجرت یا دوسرے لفظوں میں جائز مفادات کی قربانی انسان کی خداپرستی کا امتحان بھی ہے اور اسی کے ذریعہ سے خدا کا دین بھی خدا کی زمین پر قائم ہوتا ہے۔ یہ اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد کا لازمہ ہے۔ جو لوگ اس کام میں حصہ لینے کے لیے آگے بڑھیں، مگر ان کا حال یہ ہو کہ وہ دنیا میں اپنا مقام محفوظ کر لینے کے بعد آخرت کا کام کرنا چاہتے ہوں، جو اپنے معیار زندگی کو گھٹانے پر تیار نہ ہوں جو اپنے بچوں کے مستقبل کو خطرے میں ڈالنا گوارا نہ کریں جو دنیوی زندگی میں اپنی تمناؤں اور خواہشوں کو قربان نہ کریں، جو یہ نہ سوچیں کہ اپنی معاشی مصروفیات میں کمی کرکے دین کی خدمت کے لیے اور زیادہ وقت نکالنا چاہیے۔ بلکہ اس کے برعکس جو ہمیشہ یہ سوچتے ہوں کہ کس طرح اور کوئی بڑا کام مل جائے تاکہ اپنے بڑھے ہوئے اخراجات کو پورا کیا جا سکے۔ مختصر یہ کہ جن کے اندر اتنا حوصلہ نہ ہو کہ وہ آج کے فائدے پر کل کے فائدے کو ترجیح دے سکیں۔ ایسے لوگوں نے کبھی تاریخ میں دین کو سربلند نہیں کیا ہے اور جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں آئندہ بھی ایسے لوگوں کے ہاتھوں یہ کام نہیں ہو سکتا۔

جہاد

اب جہاد کو لیجیے۔ جہاد کے معنی ہیں کسی چیز کے لیے اپنی آخری کوشش صرف کرنا۔ اتنی کوشش کرنا کہ آدمی تھک جائے۔ ہجرت کی طرح یہ جہاد بھی کسی وقتی کارروائی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس کا تعلق ساری زندگی سے ہے۔ جہاد صرف میدان جنگ میں نہیں ہوتا بلکہ ایمان لانے کے بعد ہی سے اس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور زندگی کے آخر لمحات تک جاری رہتا ہے۔ ایک غیر اسلامی معاشرہ میں جہاد کی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسی مارکس کے جدلیاتی فلسفہ میں ایک نظام کے اندر اس کے ضد کی ہوتی ہے۔ یہ ایک زبردست چیلنج ہے جو کسی نظام کے اندر اس کے عدو کی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ جاہلی معاشرہ میں کسی کا اسلام قبول کرنا دراصل وقت کے خلاف فیصلہ کرنا ہے۔ یہ فیصلہ اگر صحیح شعور اور مکمل عزم کے ساتھ ہو تو بالکل لازمی نتیجہ کے طور پر معاشرہ کے ہر فرد اور اس کے تمام اداروں سے اس کا ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وقت کا معاشرہ ہوتا ہے جو اپنے تمام نظری اور عملی پہلوؤں کے اعتبار سے زندگی کے تمام شعبوں پر چھایا ہوا ہوتا ہے دوسری طرف یہ صاحب ایمان ہوتا ہے جو اس سے مختلف ایک اور ہی طرز زندگی کو اپنے گرد و پیش کی دنیا میں دیکھنا چاہتا ہے۔ ماحول کے ساتھ اس کا یہ اختلاف اس کو ایک

ایسی تیز گیس کی مانند بنا دیتا ہے جو کسی محدود خول کے اندر بند ہو اور ہر آن اس سے نکلنے کے لیے بے قرار ہو۔ یہ کش مکش اور جدوجہد کا عمل آدمی کے اپنے نفس سے شروع ہوتا ہے اور تمدن کے مختلف گوشوں میں پھیلتا ہوا ہر اس معاملہ تک پہنچ جاتا ہے جس کا تعلق انسانی زندگی سے ہو۔ یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور دن بہ دن تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب یہ کش مکش اپنے آخری نقطے پر پہنچ جاتی ہے۔ ماحول کا بند ٹوٹ جاتا ہے اور جاہلی نظام شکست کھا کر اسلام کے لیے جگہ خالی کر دیتا ہے۔

جہاد کی اصل حقیقت خدا کی راہ میں چلنے کے لیے اپنے آپ کو تھکانا ہے۔ قرآن میں خدا کے دین کو "نجد" کہا گیا ہے جس کے معنی بلند مقام کے ہیں اور اس دین پر عمل کرنے کو اونچائی پر چڑھنے سے تشبیہ دی گئی ہے (بلد-۱۱-۱۰) اس مثال سے ہم جہاد کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ دنیا میں زندگی گزارنے کی صرف دو راہیں ہیں۔ ایک نفس کی خواہش کے مطابق اور دوسری خدا کی مرضی کے مطابق۔ ایک غیر ذمہ دارانہ زندگی ہے اور دوسری ذمہ دارانہ زندگی۔ پہلی راہ بے حد آسان ہے اور دوسری راہ بے حد دشوار۔ پہلی صورت میں اوپر سے نیچے آنا ہوتا ہے اور دوسری صورت میں نیچے سے اوپر جانا۔ گاڑی کو ڈھلوان راستے پر چھوڑ دیجیے تو وہ خود بخود لڑھکتی چلی جائے گی۔ اس کے لیے کسی غیر معمولی کوشش کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر اسی گاڑی کو کسی بلندی پر چڑھانا ہو تو مسلسل محنت کی ضرورت ہے۔ ایک تھکا دینے والی مشقت کے بغیر کوئی شخص اپنی گاڑی کو نیچے سے اوپر نہیں لے جا سکتا۔ یہی عمل جب وقت اور خواہش کے خلاف اپنی زندگی کو خدا کی طرف لے جانے کے لیے کیا جائے تو اس کو ہم جہاد کہتے ہیں۔

انسان جب یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے گا، تو اس کو فوراً معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو ایسی طاقتیں ہیں جو اس کے اس ارادہ کی راہ میں زبردست روک ہیں۔ ایک خود اس کا اپنا نفس، دوسرے طاغوت۔ نفس سے مراد انسان کا یہ جذبہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے لیے لذّت اور آرام کو پسند کرتا ہے۔ اس کو ہمیشہ آسانی کی تلاش رہتی ہے وہ عزّت اور برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے بلکہ جدھر اس کا جی چاہتا ہے اس طرف نکل جاتا ہے۔ یہ جذبہ اس کو اکساتا ہے کہ ہر وہ کام کرے جس سے اس کی ان خواہشوں کو تسکین ملتی ہو اور ایسا کوئی کام نہ کرے جس سے اس کی ان خواہشوں پر ضرب پڑے۔ اور طاغوت سے مراد خارج کا وہ غلط اقتدار ہے جو ماحول کی روایات، وقت کے نظریات اور عوام الناس کی خواہشوں کی صورت میں آدمی کے اوپر دباؤ ڈالتا ہے۔ یہ طاغوت افراد کی زندگی میں متکبرانہ روش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اجتماعی زندگی میں غیر خدائی اقتدار کی صورت میں۔ یہ خارجی قوتیں براہ راست بھی مزاحمت کرتی ہیں اور بالواسطہ بھی۔ بالواسطہ اس طرح کہ سوسائٹی پر عملاً قابض ہونے کی وجہ سے زندگی کے تمام گوشوں میں انھیں کے نظریات پھیل جاتے ہیں۔ انسان کے لیے اس کے سوا کوئی شکل نہیں ہوتی کہ ان کو مانے اور اپنے آپ کو ان سے ملوث کرے، اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور براہ راست اس لیے کہ اس طرح کے ایک ماحول میں حق پر چلنے کا ارادہ ان قوتوں

کی حیثیت رکھتا ہے وہ رائج الوقت نظام کے لیے موت کی پیشین گوئی ہے۔ اس لیے جو لوگ اس قسم کا ارادہ لے کر اٹھتے ہیں وہ ان کو روکنے اور ان کو کچل دینے کے لیے اپنا پورا زور صرف کرتی ہیں اور اپنے دائرہ میں ان کو زندگی کے مواقع سے محروم کر کے رکھ دیتی ہیں۔

ان حالات میں جب کوئی شخص خدا کی طرف بڑھتا ہے تو اس کو اپنے اندر سے لے کر باہر تک، خیالات سے لے کر عمل کی دنیا تک قدم قدم پر بےشمار رکاوٹوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ کہیں آرام کے مقابلہ میں تکلیف گوارا کرنا ہوتا ہے، کہیں ایک لذیذ رجحان کو چھوڑنے اور ایک خشک عقیدہ کو قبول کرنے کے لیے کش مکش کرنی پڑتی ہے۔ کہیں ملتے ہوئے ناجائز فائدوں کے ڈھیر کے بجائے ایک حقیر حاصل پر آمادہ ہونے کے لیے اپنے آپ سے زبردستی کرنی پڑتی ہے۔ کہیں عزت اور ناموری کے بجائے گم نامی اور ذلت پر قانع ہونے کے لیے مجاہدہ کرنا ہوتا ہے۔ کہیں اپنے جائز حقوق اور اپنے واقعی مفادات سے محرومی پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ غرض اس کے سامنے دو مختلف راہیں کھلی ہوتی ہیں اور اس کو پورا اختیار ہوتا ہے کہ جدھر چاہے چلا جائے۔ ایک طرف جانے میں دنیا کی ہر چیز ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور دوسری طرف جانے میں بظاہر کچھ بھی ملتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ اس کا نفس مجبور کرتا ہے کہ آسان راستہ کی طرف جائے۔ خارجی قوتیں اس مقصد کے لیے اپنا پورا وزن اس کے اوپر ڈال دیتی ہیں۔ مگر وہ ان ساری مزاحمتوں کے باوجود آسان اور پرلطف راستے کو چھوڑ دیتا ہے اور کھینچ کر اپنے کو مشکل راستہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی کش مکش کا نام جہاد ہے۔

جس چیز کو ہم اجتماعی انقلاب کہتے ہیں وہ بھی اسی کش مکش کا ایک قدرتی نتیجہ ہے جس کے بعد ماحول پر اسلام کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اجتماعی انقلاب برپا کرنا اسلام کا اصل مقصود ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک مسلسل عمل کا آخری انجام ہے۔ اسلام کے مطابق جینے اور مرنے کا ارادہ جو ابتداً قلب کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ وہ جب عمل کی صورت اختیار کرتا ہے اور ذہن سے نکل کر ماحول میں پھیلنا شروع ہوتا ہے تو اسی پھیلاؤ کے ایک مخصوص دائرہ کو ہم اجتماعی انقلاب کہتے ہیں۔ انقلاب کو مصنوعی درخت کی طرح اگایا نہیں جا سکتا اور نہ اس کو بوریوں میں بھر کر کہیں باہر سے لایا جاتا ہے بلکہ وہ ایک عمل کے طبعی نتیجہ کے طور پر خود اپنی زمین سے ابھرتا ہے۔ جس طرح انڈے کے اندر ایک زندہ بچہ کا وجود یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک روز اوپر کا خول ٹوٹ جائے اور جیتا جاگتا بچہ اس کے باہر آ جائے۔ ٹھیک اسی طرح مخالف ماحول کے اندر ایک اسلامی گروہ کی موجودگی اس کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے۔ اگر یہ گروہ اپنے ایمان میں مخلص ہے اور عقیدہ کو عمل کی شکل دینے کا سچا عزم رکھتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر آن باطل کی دیوار کو متزلزل کر رہا ہے۔ ایسا ایک گروہ لازمی طور پر دیوار کو توڑ دے گا۔ وہ اس کے اندر نہیں ٹھہر سکتا۔

جہاد ہر اس رکاوٹ سے لڑنے اور اس سے کش مکش کرنے کا نام ہے جو دین پر عمل کرنے کے سلسلے میں پیش آئے اور چونکہ یہ رکاوٹ انسان کے اندر سے بھی ہوتی ہے اور باہر سے بھی، اس لیے جہاد میں آدمی کبھی خود

اپنے نفس کے بالمقابل ہوتا ہے اور کبھی خارجی دنیا سے کش مکش کرتا ہے۔ اس کو کبھی خود اپنی خواہشوں سے لڑنا ہوتا ہے، کبھی زبان سے دوسروں کے طرزِ عمل پر گرفت کرنی ہوتی ہے اور کبھی ہاتھ کی قوت سے راہِ حق کی رکاوٹوں کو دور کرنا ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

جَاهِدُوا اَهْوَاءَكُمْ كَمَا تُجَاهِدُونَ اَعْدَاءَكُمْ (مفردات امام راغب) اپنی خواہشوں سے جہاد کرو جس طرح تم اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو۔

مگر جہاد اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے صرف کسی ظاہری عمل کا نام نہیں ہے بلکہ اس مخصوص کیفیت کا نام ہے جو کسی عمل کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے۔ ظاہری شکلیں اسی کیفیت جہاد کو پیدا کرنے کے لیے ہیں نہ کہ خود ان ظاہری شکلوں کا نام جہاد ہے۔ ایک شخص رات دن کی کوشش سے اسلام پر ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب لکھتا ہے۔ بظاہر یہ جہاد کی ایک شکل ہے۔ لیکن اس کا مقصد اگر یہ ہے کہ اس کتاب سے اس کی شہرت ہوگی یا اس کو مالی فوائد حاصل ہوں گے تو اس کے اس عمل کی کوئی قیمت نہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں وہ جہاد کہے جانے کا مستحق نہیں ہے۔ اس کے برعکس کوئی نیک کام کرتے ہوئے جب اس کے دل میں ایک غلط خیال گزرتا ہے اور اس تصور سے وہ کانپ اٹھتا ہے کہ اس طرح اس کا سارا کیا کرایا مٹی ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں اور بے اختیار وہ کہہ اٹھتا ہے کہ ۔۔ "خدایا! مجھے شیطان کے حوالے نہ کر ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا ۔۔" تو یہ جہاد ہے۔

یہ بات صرف جہاد ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ دوسری عبادات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ دین میں جو کام بھی کرنے کے لیے بتائے گئے ہیں وہ محض اپنی شکل کے اعتبار سے مطلوب نہیں ہیں۔ بلکہ حقیقت کے اعتبار سے مطلوب ہیں۔ جن اذکار اور دعاؤں کی فضیلت بیان کی گئی ہے، جن عبادات کے ادا کرنے کو فرض قرار دیا گیا ہے، جن اخلاق واعمال کو یہ اہمیت دی گئی ہے کہ ان کو اختیار کیے بغیر سرے سے دعوئے ایمان ہی معتبر نہیں ہوتا۔ ان سب کا مطلب دراصل یہ بتانا ہے کہ خدا پرستانہ زندگی کے مظاہر کیا ہوتے ہیں نہ یہ کہ کن مظاہر کا نام خدا پرستی ہے۔ اصل میں خدا کو جو چیز مطلوب ہے وہ یہ نہیں ہے کہ زبان سے اس کے لیے چند تعریفی کلمات کا ورد کر لیا جائے، نماز روزہ اور حج کے نام پر کچھ مخصوص عبادتی افعال انجام دیدیے جائیں۔ مال میں سے ایک مقررہ حصہ نکال کر غریبوں میں بانٹ دیا جائے۔ یا زبان وقلم کے ذریعہ سے خدا کے دین کی تبلیغ کر دی جائے۔ بے شک یہی وہ اعمال ہیں جو خدا پرستانہ زندگی کے لیے لازمی پروگرام کی حیثیت رکھتے ہیں اور خدا پر ایمان جب بھی انسانی زندگی میں ظہور کرے گا وہ انہیں شکلوں میں ظہور کرے گا۔ ان کے ظاہر ہونے کا کوئی اور قالب اللہ تعالےٰ نے نہیں بنایا ہے۔ مگر ان خارجی شکلوں کے پیچھے وہ اصل چیز جو خدا کو مطلوب ہے اور جس کی موجودگی کسی آدمی کو اس بات کا مستحق بناتی ہے کہ اللہ تعالےٰ کی جنتیں اسے حاصل ہوں، وہ دراصل دل کی یہ اندرونی کیفیت ہے کہ آدمی کے جذبات وخیالات بالکل خدا کی مرضی کے تابع ہو جائیں۔ اس کو وہی چیز پسند ہو جس کو خدا پسند کرتا ہے۔ اور وہی چیز ناپسند ہو جس کو خدا ناپسند کرتا ہے۔ جو چیز خدا کی مرضی کے خلاف ہو اس کا وہ دشمن بن جائے اور جو چیز خدا کو محبوب ہو اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنا

آخری سرمایہ تک قربان کر دے۔

قرآن کی اسی بتائی ہوئی زندگی کو پورا کرنے یا نہ کرنے پر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔ ایک شخص جو اس حقیقت کو جان چکا ہو کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے، اور پھر جو اس واقعہ پر بھی ایمان لایا ہو کہ آخرت کا ایک عظیم دن آنے والا ہے جب پوری نسل انسانی خدا کی عدالت میں کھڑی کی جائے گی۔ اس کی خواہش اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ قیامت کے اس ہولناک دن، جب وہ مالک کائنات کے سامنے کھڑا ہو تو اس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ یہ کہہ دے کہ یہ میرا بندہ ہے جو دنیا کی زندگی میں میرا وفادار رہا۔ مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ مقام کسی کو محض خواہش کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی معمولی حکومتوں کا یہ حال ہے کہ وہ کسی کو وفاداری کا سرٹیفکٹ صرف اس وقت دیتی ہیں جب کہ وہ اس کا دین، اخلاق اور ضمیر سب کچھ اس سے خرید لیتی ہیں۔ پھر خدا جو تمام حاکموں کا حاکم ہے، جو بے حد غیرت مند ہے جو اپنی خدائی میں کسی کی معمولی شرکت بھی گوارا نہیں کرتا، وہ کیا محض دل کی ایک خواہش یا زبان کی حرکت سے خوش ہو جائے گا اور کسی کو محض اس بنا پر وفاداری کا اعزاز بخش دے گا کہ وہ ایسا چاہتا ہے، خواہ اس نے اپنی وفاداری کو عملاً اس کے لیے خاص کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری تمام وفاداریوں کی طرح خدا کا وفادار بننے کی خواہش بھی ایک عظیم جد و جہد کا تقاضا کرتی ہے۔ دنیا کے اداروں میں کسی کی اہمیت صرف اس وقت تسلیم کی جاتی ہے جب وہ اپنی بہترین صلاحیتیں اس کے لیے وقف کر دے۔ ایک دکان اپنے اندر نفع کے امکانات کسی کے اوپر صرف اس وقت ظاہر کرتی ہے جب آدمی اپنا سب کچھ اسے دے دیتا ہے۔ حکومتوں کے نزدیک کوئی شخص صرف اسی وقت اعتماد اور احترام کا مستحق بنتا ہے جب وہ اپنے آپ کو پوری طرح اس کی نذر کر چکا ہو۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی وفاداری کا مقام صرف اسے حاصل ہوتا ہے جو اپنی قربانیوں کے ذریعہ اس کا استحقاق ثابت کر دے ۔۔ شرک نہ دنیا کے معبودوں کو پسند ہے اور نہ خدا کو۔

اس حقیقت کو سامنے رکھیے اور پھر اس دن کا تصور کیجیے جب ہم اور آپ اور تمام اگلے پچھلے پیدا ہونے والے خدا کے پاس اس حال میں جمع کیے جائیں گے کہ ایک رب العالمین کے سوا سب کی آوازیں پست ہو چکی ہوں گی۔ جس دن آدمی اپنے سوا ہر ایک کو بھول جائے گا۔ خواہ وہ اس کا دوست اور قریب ترین عزیز کیوں نہ ہو۔ جس دن صرف حق بات میں وزن ہو گا اور اس کے سوا تمام چیزیں اپنا وزن کھو چکی ہوں گی۔ جس روز آدمی حسرت کرے گا کہ کاش اس نے ساری عمر صرف آج کی تیاری میں صرف کر دی ہوتی۔ یہ فیصلہ کا دن ہو گا۔ ہمارے درمیان اور اس دن کے درمیان صرف موت کا فاصلہ ہے ۔۔ وہ موت جس کے متعلق کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کب آ جائے گی۔ آج جو لمحات ہم گزار رہے ہیں اس کے ہر لمحہ کا انجام ہم کو آئندہ کروروں سال تک بھگتنا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ایسے انجام کی طرف چلا جا رہا ہے جہاں اس کے لیے یا تو دائمی عیش ہے یا دائمی عذاب۔ زندگی کی مثال ایک ڈھلوان کی ہے جس پر سارے انسان نہایت تیزی کے ساتھ بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ ہر لمحہ جو گزرتا ہے وہ ہم کو اس **آخری انجام** سے قریب تر کر دیتا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے لیے مقدر ہے۔

ہم کو زندگی کے صرف چند دن حاصل ہیں۔ ایسے چند دن جن کا انجام کروروں اور اربوں سال نہیں بلکہ ابدالآباد تک بھگتنا پڑے گا۔ جس کا آرام بے حد خوش گوار ہے اور جس کی تکلیف بے حد دردناک۔ ہر بار جب سورج غروب ہوتا ہے تو وہ آپ کی عمر میں ایک دن اور کم کر دیتا ہے۔ اس عمر میں جس کے سوا آنے والے ہولناک دن کی تیاری کا اور کوئی موقع نہیں۔ ہماری زندگی کی مثال برف بیچنے والے دوکان دار کی ہے، جس کا اثاثہ ہر لمحہ پگھل کر کم ہوتا جا رہا ہو اور جس کی کامیابی کی شکل صرف یہ ہو کہ وہ وقت گزرنے سے پہلے اپنا سامان بیچ ڈالے ورنہ آخر میں اس کے پاس کچھ بھی نہ ہوگا اور دکان سے اس کو خالی ہاتھ اٹھ کر جانا پڑے گا۔ پھر قبل اس کے کہ موت آ کر ہم کو اس دنیا سے جدا کر دے، جہاں صرف کرنا ہے اور اس دنیا میں پہنچا دے جہاں کرنا نہیں بلکہ صرف پانا ہے، ہمارے لیے ضروری ہے کہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا صحیح مصرف سوچ لیں۔ ہم سب کو ایک روز مالکِ کائنات کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ پھر خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنے رب کے پاس اس حال میں پہنچیں کہ دنیا میں وہ حق کے لیے اپنا سب کچھ لٹا چکے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے انھیں پر نظر کرے گا۔

(تقریر اجتماع جماعت اسلامی ہند بمقام لکھنؤ، یکم مارچ ۱۹۵۸ء)

گلاب کی سات سو قسمیں

شمالی ہند کی سردیوں کے موسم میں گلاب کے پھول سب سے زیادہ اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ یہاں ایک عمدہ پھول ۲۵ پیسے میں مل جاتا ہے مگر اس پھول کی قیمت یورپ میں آٹھ روپے ہو جاتی ہے۔ یورپ کی پھول منڈیوں میں کروڑوں ڈالر کے گلاب فروخت ہوتے ہیں، تاہم ہندوستان کی برآمدات میں گلاب کا کوئی حصہ نہیں۔

اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن نے ۱۹۶۹ء میں گلاب کے پھول یورپ بھیجنے کی کوشش کی تھی۔ مگر گلاب کی قیمت اسی وقت ہے جب کہ وہ اپنی فطری شادابی کی حالت میں اپنی منڈی میں پہنچ جائے اس لیے کہ روانگی کا خصوصی اہتمام کرنا ہوتا ہے جس میں ہم کو کامیابی نہ ہو سکی۔ اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کی رپورٹ میں کہا گیا ہے: "گلاب کے پھولوں کی یہ برآمد آزمائشی تھی مگر جب ہم کوالٹی، تازگی، پیکنگ اور ہوائی سفر کے مسائل کو حل کر لیں گے تو اس تجارت میں ہماری کامیابی یقینی ہے۔"

انڈین اگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے باغبانی کے شعبہ نے گلاب کی تقریباً ایک درجن قسموں کی نشاندہی کی ہے جو یورپ کی منڈیوں میں عام طور پر دوسرے ملکوں سے آتی ہیں۔ اس ادارہ نے گلاب کی پیدائش کے بعض ترقی یافتہ طریقے بھی معلوم کیے ہیں جو یورپی منڈیوں کی ضروریات کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں۔

گلاب کے برآمدی امکانات کو دیکھ کر دہلی کے اطراف کے تقریباً ۲۰ کسانوں نے اس کی کاشت میں دلچسپی لینا شروع کر دیا ہے۔ ذاکر حسین روز گارڈن، جس کو دہلی ایڈمنسٹریشن چلاتا ہے، اس نے بھی اس سلسلے میں کام شروع کیا ہے۔ بلراج اردرا کے فارم میں ۷۰ ہزار گلاب کے پودے لگائے گئے ہیں۔ گلاب کا پھول قدیم زمانہ میں صرف شاعروں کے لیے مضمون بندی کا ذریعہ تھا، مگر آج وہ قیمتی زر مبادلہ حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔

اسلام کا مطلب ہے اپنے آپ کو خدا کے آگے سپرد (SURRENDER) کر دینا۔ مسلمان وہ ہے جو اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ وہ مرنے کے بعد ہر ایک سے اس کے کارنامہ زندگی کا حساب لے گا۔ اس کے بعد اپنے وفادار بندوں کے لئے دائمی جنت کا فیصلہ کرے گا، اور غیر وفادار بندوں کو دائمی جہنم میں ڈال دے گا۔ اس احساس کے تحت جو زندگی بنتی ہے، اس کو ایک لفظ میں آخرت رخی زندگی (AKHIRAT ORIENTED LIFE) کہہ سکتے ہیں۔

یہ احساس جب کسی دل میں پیدا ہو جائے تو اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ وہ ہر وقت خدا سے ڈرنے لگتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کو کھلے اور چھپے ہر حال میں دیکھ رہا ہے، بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ انصاف اور خیر خواہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ہر انسان کے پیچھے اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔ وہ کبھی اس بات کو نہیں بھولتا کہ بالآخر وہی چیز صحیح قرار پائے گی جس کو خدا صحیح کہے اور وہ سب کچھ غلط ٹھہرے گا جس کو خدا غلط ٹھہرائے۔

اسی کے ساتھ مسلمان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی اس حقیقت کو دوسری تمام قوموں تک پہنچائے۔ اس سنگین واقعہ سے لوگوں کو باخبر کرنے کے لئے پہلے انبیاء آتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری نبی آخر الزماں کی امت پر ڈال دی گئی ہے، مسلمان پر جس طرح خود عمل کرنے کی ذمہ داری ہے، اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔ ان میں سے کوئی ایک کام، دوسرے کام کے لئے خدا کے یہاں عذر نہیں بن سکتا۔

اسلامی مرکز کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو دنیوی مہم کے بجائے اُخروی مہم کے طور پر سامنے لایا جائے ۔ اس کا منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر ان احساسات کو جگائے ، اور دوسری قوموں تک حق کا پیغام پہنچانے کی تدبیریں اختیار کرے ۔

اسلامی مرکز کے سامنے پہلا کام یہ ہے کہ اسلام کو وقت کے اسلوب اور زمانہ حاضر کی زبان میں لوگوں کے سامنے لایا جائے ۔ تاکہ جس اسلام کو وہ تقلیدی طور پر مانتے ہیں ، وہ ان کے ذہن کی غذا بن سکے ، وہ ان کے اندر عمل کی حرارت پیدا کرنے لگے ۔ وہ ان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ نہ ہو ، بلکہ وہی ان کی کل زندگی بن جائے ۔ ہر عہد کا ایک فکری معیار ہوتا ہے ، اور کسی انسان کی زندگی میں کوئی فکر اسی وقت غالب فکر بن کر داخل ہوتا ہے جب کہ وہ اس کو اس فکری معیار پر ملے جس کے اندر وہ سانس لے رہا ہے ۔

اسلامی مرکز کے سامنے دوسرا کام ، مسلمانوں کو داعی گروہ کی حیثیت سے اٹھانا ہے ۔ دعوت ہی واحد کام ہے جو مسلمانوں میں عمل کا حوصلہ ابھار سکتا ہے ، ان کے اندر اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرتا ہے ، ان کو خدا کی اجتماعی نصرتوں کا مستحق بناتا ہے ۔ ان کو آخرت میں خدا کے گواہ کا درجہ عطا کرتا ہے جس سے بڑا کوئی درجہ انسان کے لئے نہیں ۔

اسلامی مرکز انھیں دونوں مقاصد کے تحت قائم کیا گیا ہے ۔ کسی قسم کی سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔ یہ مسلمانوں کو اور تمام انسانوں کو آنے والے یوم الحساب سے ہوشیار کرنے کی ایک مہم ہے ۔ زندگی میں آدمی کو بے شمار مسائل نظر آتے ہیں ۔ مگر موت کے بعد ایک ہی مسئلہ اس کے سامنے ہوگا ۔ ہم چاہتے ہیں کہ موت سے پہلے آدمی اس مسئلہ سے آگاہ ہو جائے ، موت سے پہلے وہ اس کی تیاری میں اپنے کو لگا دے ۔

ہمارا پروگرام

۱ عربی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں رسائل کا اجرا، جس کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی دعوتی ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا جا سکے اور اسلام کو جدید اسلوب اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق مدلل کیا جائے۔

۲ قرآن کے ترجمے دنیا کی تمام زبانوں میں شائع کرنا اور ان کو رعایتی قیمت کے ساتھ لوگوں تک پہنچانا۔

۳ قرآنی علوم کی تدوین اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت۔

۴ حدیث، سیرت، حالاتِ صحابہؓ، تاریخ اسلام (نہ کہ تاریخ فتوحات) پر سادہ، واقعاتی انداز میں کتابوں کی تیاری اور ان کو مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۵ ایسی درس گاہ کا قیام جس میں قرآن، حدیث، سیرت، تقابلی مذہب، عربی زبان اور دوسری زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو۔

۶ اسلامیات اور مختلف مذاہب کے مطالعہ کے لئے ایک مکمل لائبریری کا قیام۔

۷ مختلف علاقوں اور ملکوں میں تبلیغی وفود بھیجنے کا انتظام۔

۸ اسلام کے تاریخی آثار اور دستاویزات کا میوزیم قائم کرنا۔

۹ علمی طرز فکر اور حقیقت پسندانہ مزاج پیدا کرنا۔

۱۰ جدید طرز کے پریس کا قیام جہاں مختلف زبانوں میں اعلیٰ چھپائی ہو سکے۔

۱۱ ایسے ادارہ کی تشکیل جہاں تمام ضروری دینی شعبے قائم ہوں اور غیر مسلم وہاں آکر اسلام کو سمجھ سکیں۔

اسلامی مرکز کے سلسلہ میں تمام امور کے لئے براہ راست صدر سے رجوع کیا جائے

خطوط وغیرہ پر حسب ذیل پتہ تحریر کیا جائے:

مولانا وحید الدین خاں، صدر اسلامی مرکز، جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

MAULANA WAHIDUDDIN KHAN
PRESIDENT, ISLAMI MARKAZ
JAMIAT BUILDING
QASIMJAN STREET, DELHI 6